بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

My Grace is Sufficient For You

Life History Of Ghulam Mashi Numan

"میرا فضل تیرے لئے کافی ہے"

غلام مسیح نعمان کی سرگزشت

ترتیب

باب نمبر	عنوان	صفحہ
01	کوئی بتلاؤ	04
02	آس پاس	07
03	ہم بھی دیکھیں گے	11
04	ارزانیٔ حیات	13
05	مختلف تجربات	16
06	اعزازتِ خدمت	22
07	ایک ہی خواہش	26
08	مجروح انسان	37
09	لا تقنطوا	43
10	سرِ راہ	50
11	نمازِ عشق	66
12	سوالات	76

کوئی بتلاؤ!

سیدنا عیسیٰ مسیح کے قدموں میں آنے کے بعد جب کبھی لوگوں نے میری تبدیلی کا سبب پوچھا تو جیسا شخص اپنے سامنے پایا ویسا ہی اس کو جواب دے دیا۔ اگر کسی نے حجت کی خاطر پوچھا تو اس سے صرف یہ کہہ کر پیچھا چھڑالیا کہ،

" یہ میری زندگی کا ذاتی معاملہ ہے۔"

اگر کسی ملّا بھائی نے دریافت کیا تو پہلے اس سے یہ وعدہ کرلیا کہ:

" اگر میری بات آپ کے ہاضمہ پر گراں گزرے تو جھگڑا تو نہیں کروگے؟"

لیکن ایسے بیشتر حضرات سے بھی واسطہ پڑا جنھوں نے خاکساری کی گواہی یا حالات کی تبدیلی کی داستان سنکر اصرار کیا کہ اس کو لکھا جائے۔

راقم نے اپنی مسیحی زندگی کے دوران اور کاہنی خدمت کے دوران خداوند اپنے آقا (سیدنا مسیح) کے لئے بہت کچھ کہا اور لکھا بھی ہے، لیکن اپنی تبدیلی کے بارے میں اب تک تحریر کچھ نہیں کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شاید انگریزی میں آدھ کتابچہ چھپا ہوگا، وہ بھی بیرون ملک، لیکن ملک کے اندر چند مصلحتوں کے پیش نظر ابھی تک اپنے قلم سے کچھ نہیں لکھا۔

مصلحتوں کے بارے میں آپ یہ خیال نہ کرلیں کہ میں حالات وزمانہ سے سمجھوتہ کرنے کا عادی ہوں، یا موقع شناس ہوں یا دوسروں سے مرعوب ہوں، ہر گز نہیں بلکہ جہاں میں رہا ہوں، میرے عزیز مسیحی دوست بخوبی جانتے ہیں کہ میرا ماضی کیا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ میرے احباب میں سے جن لوگوں نے مجھے قریب سے دیکھا ہے وہ کچھ لکھتے، نہ کہ میں، پھر بھی چند باتیں ہیں جو دوسرا بیان نہیں کرسکتا کیونکہ جن تجربوں میں سے خود گزرا ہوں ان کو میں خود ہی بیان کرسکتا ہوں۔

علاوہ ان باتوں کے اس دنیا میں کسی چیز کو ترک کرنے کی وجوہات ہیں:

۱۔ ایک سبب یہ ہوتا ہے جس سے انسان ترکِ ارادہ کرتا ہے۔

۲۔ دوسرا سبب انسان کو ترکِ وطن کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

۳۔ مگر ترکِ مذہب کے لئے تو کوئی بہت بڑا سبب ہونا چاہیے۔

کیونکہ ایمان ومذہب کے نام پر ہمارے اس خطہ زمین، ہندو پاک میں لوگوں نے اپنا سب کچھ قربان کردیا اور اپنی بیٹیوں تک کی عصمتوں کو ایمان کے نام پر قربان کرکے، اپنے ایمان ومذہب پر قائم ہونے والے ملک میں داخل ہو کر، خدائے عزوجل (باعزت اور بزرگ) کے حضور، سجدہ ریز ہوئے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر میں مختصر یہ بیان کروں گا کہ وہ کون سی وجوہات تھیں، جنہوں نے مجھ کو زندگی میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرات دی۔

میں ترک اسلام کی داستان کے چند حساس پہلوؤں کی زیر بحث نہیں لاؤں گا جو دوسروں کی دلآزاری کا سبب ہوں۔ کیونکہ اس کتابچہ کو رقم کرنے کا جو مقصد میرے سامنے ہے وہ صرف یہ ہے کہ چند ایمان افروز قسم کی باتیں، جن کا مجھے ذاتی تجربہ ہے بیان کی جائیں۔ کیونکہ دورِ حاضرہ میں، اس ملک کی مسیحی کلیسیا کسی قدر حالاتِ عالم کے تحت سہی سی ہے، اس لئے میرا ایمان ہے کہ یہ کتابچہ بہت سے عزیزوں کے لئے باعثِ تقویت ہوگا۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

آس پاس

جب شعور کی آنکھ کھلی تو اپنے آس پاس چار بڑے بھائیوں اور ایک چھوٹے بھائی محمد رمضان کو پایا۔

نرم دل والدہ اور شفیق والد اور چار بھائیوں سے بھرا ہوا گھر نظر آیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب زندگی اور خدا کا منصوبہ، مجھے جنوبی سندھ میں لے آیا، تو چودھری علی احمد باجوہ نے جو، برادرم چودھری نظیر احمد کے والد مرحوم تھے، بتایا کہ میرے والد چودھری لعل خان، ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ لیکن کوئی جائیداد کا جگھڑا تھا، جس کی وجہ سے میرے والد محترم، اپنے ایک فوجی افسر دوست منشی کے ہاں ایک گاؤں میں رہتے تھے اور آپ نے کبھی بھی، اپنے حسب ونسب کا ہم سے بچپن میں ذکر نہیں کیا تھا۔

ظفر وال ضلع سیالکوٹ میں والد صاحب نے ہم چھوٹے لڑکوں کی تعلیم کی خاطر مکانات بنوائے، کیونکہ اسکول گاؤں سے دور پڑتا تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کا نہ ہی دستور تھا اور نہ ہی خدا نے میرے والدین کو کوئی بیٹی دی تھی۔

والد صاحب خود فوجی تھے اور غالباً پہلی جنگِ عظیم میں صوبہ دار تھے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر مہاراج کشن جب عنیر حاضر ہوتے تھے، تو پینشن یافتہ فوجی اپنی تصدیق کے سلسلے میں والد صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے۔

میں نے اپنے ہوش میں، واپنے والد صاحب کو، کوئی محنت طلب کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بھائی سب سے بڑے تھے اور اس وقت کی بارانی زمین جو، نالہ ڈیک کے کنارہ پر تھی، اتنی گندم پیدا کردیتی تھی کہ ہمیں اناج خریدنا نہیں پڑتا تھا۔

گھر میں فارغ البالی تھی، محبت اور پیار تھا ، والدہ کی مامتا اور والد کی شفقت تھی، بھائیوں کی طرف سے پیار تھا۔ برادری میں اور ماحول میں والد محترم کی درویشانہ زندگی کی وجہ سے بہت عزت تھی۔

والد صاحب کبھی بھی کسی اپنے مقدمہ یا قضیہ کے لئے کسی عدالت میں نہیں جاتے تھے۔ لیکن اگر کسی پر زیادتی ہوتی، اور وہ اپنی غربت کی وجہ سے انصاف کو خرید نہ سکتا تو اس کے لئے آپ سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔

والد صاحب سے جنگ اور لڑائی کی کہانیاں اور افریقہ کے جنگلات میں پیش آنے والے واقعات سننے میں مزہ آتا تھا۔ جب ہم اکثر والد کی مرضی کے خلاف ان کو قصے اور کہانیاں سنانے پر مجبور کرتے تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سنادیا کرتے تھے۔

اچانک رمضان کو غالباً نمونیہ ہوگیا اور وہ چند ہی دنوں میں چل بسا! اب میں اکیلا رہ گیا، دوسرے بھائی بڑے تھے اور ان میں اکثر گھر پر کوئی نہیں ہوتا تھا۔ دو بھائیوں کا کاروبار کشمیر میں تھا اور دو لاہور شہر میں تھے۔

میرے ذمہ گھر کے تمام کاموں سے بڑھ کر یہ تھا کہ میں، صبح سویرے اٹھ کر باہر حویلی سے دودھ، لایا کرتا تھا، لیکن میری غیر رضامندی کی وجہ سے یہ کام بھی ایک ملازم نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اب میرا شوق صرف، برائے نام پڑھائی اور زیادہ شکار تھا۔ والد صاحب کی شکار کھیلنے والی رائفل چونکہ بہت ہلکی تھی، اس لئے اس کا جھٹکا بھی کم پڑتا تھا۔ میں نے اس شوق میں اپنا زیادہ وقت خراب کرنا شروع کردیا۔ لیکن گھر والوں کا ارادہ تھا کہ میں اپنا دل پڑھائی میں لگاؤں۔ اسی مصلحت کے تحت مجھے جموں کے مہاراجہ زنبیر سنگھ ہائی اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ جہاں پر باقی مضامین کے علاوہ گھڑ سواری لازمی مضمون تھا۔ میں اس میں خوش تھا۔ لیکن بھائی خدا بخش مرحوم کو یہ شکایت تھی کہ اسکول میں مذہبی پڑھائی نہیں ہے۔

البتہ ہندو دھرم کے منتر وغیرہ زبانی خوب یاد ہوگئے تھے۔ اور میں ہندی زبان روانی کے ساتھ بول سکتا تھا اور سمجھ بھی لیتا تھا اور اب بھی سمجھ میں آتی ہے۔

سو بھائی صاحب نے مجھے جموں کے اسلامیہ ہائی اسکول کے بورڑنگ (ہاسٹل) میں داخل کرادیا، جو بورڈنگ کم اور یتیم خانہ زیادہ تھا۔

بورڈنگ ہاؤس سے غیر حاضری کی شکایتیں آنے لگیں ، کیونکہ میں دن میں کسی وقت، جب بھائی کاروبار میں ہوتے تھے ، تو کھانا کھانے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ ایک روز جمعہ کی چھٹی تھی، مجھے دکان پر بڑے بھائی نے طلب کیا۔ پڑوس میں ایک حلوائی کا دکان پر ایک سات آٹھ برس کا بچہ کام کرتا تھا۔ اس کو بلوا کر بھائی صاحب نے سوال کرنا شروع کردیئے۔

" برخوردار! تم صبح کتنے بجے اٹھتے ہو، کام کے لئے ؟" جی ! کوئی تین بجے اٹھتا ہوں۔ رات کے سارے " جھوٹھے" برتن صاف کرتا ہوں ۔ پھر صبح کو پوری حلوے کی کڑاھیاں وغیرہ " مانجھتا" ہوں، اور پھر پورا دن ، آپ کے سامنے ، کام میں لگا رہتا ہوں۔

" رات سوتے کتنے بجے ہو؟" گیارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں ! لڑکے نے جواب دیا ۔ پھر میری طرف بھائی جی ، مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ یہ بھی کسی ماں کا بیٹا ہے ، جو چوبیس گھنٹے میں صرف چار گھنٹے سوتا ہے۔ تم نہ تو پڑھتے ہو، نہ ہی کوئی کام کرتے ہو۔ تم موقعہ سے فائدہ اٹھاؤ، انسان بنو! ورنہ، زندگی تمہارے لئے مشکل ہوگی۔

ان باتوں کو گویا میں نے ، اپنے لئے ایک چیلنج قبول کیا اور ارادہ کرلیا کہ اب میں اپنی زندگی کی راہ خود متعین کروں گا۔ مجھے دوسروں کی مہربانیوں پر زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ سب چیزوں سے دل اچاٹ ہوگیا۔

مارچ میں دسویں جماعت کے پکے امتحان تھے۔ لیکن ہم امتحانات سے پہلے ہی فرار ہوگئے تھے۔

ہم بھی دیکھیں گے!

انگریز نے جرمن اور جاپان محاذوں پر، جنگ کا آغاز کردیا تھا، اور اسے ہمارے جیسے لوگوں کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ میں R.A.F برطانوی شاہی ہوا بازی کے محکمہ میں، چند سوالات کے معقول جواب دینے پر F.M.E جن کا تعلق ہوائی جہاز کی مشینری سے تھا، بھرتی کرلیا گیا۔

لاہور میں چند دن الٹے سیدھے پاؤں مارنے کے بعد سیدھا، کلکتہ ڈم ڈم، اور بیرک پور پہنچا دیا گیا، جہاں مزید تربیت دی گئی اور پھر رنگون اور برما کے جنگلات کی مختلف فیلڈ ورکشاپ (Field Workshops) میں تبادلے ہوتے رہے۔

اپنے پیشے اور ٹریڈ کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگ انڈین افسر مبارک کے مشورہ اور انہی کی سفارش پر محکمہ سراغ رسانی کی متحدہ ٹیم کا رکن بنادیا گیا، اور ٹریڈ سے ہٹ کر اسی میدان میں تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔

جنگ کے ابتدائی دور میں، اتحادی فوجیں چونکہ ہر محاذ پر بہت بری طرح پٹ رہی تھی اور بہت سے سستے انڈین فوجی کام آرہے تھے (مر رہے تھے) اس لئے انگریز نے وقت کی نزاکت کو سامنے رکھ کر، ترقیاں تھالی میں رکھ رکھ پیش کیں اور بہت تھوڑی عمر میں ہی، ہم ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے، دوسروں سے سیلوٹ وصول کرنے کے بھی قابل ہوچکے تھے۔

ان تمام ترقیوں میں بہت سا دخل بزرگ والد صاحب کی تربیت کا بھی تھا۔ اپنے کام میں پوری لگن، دیانت داری اور وفاداری ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے میں ہر مقام پر کامیاب و کامران رہا۔ نہ خود ہی بددیانتی کی اور نہ ہی کبھی دوسروں کی طرف سے اس قسم کے رویہ کو برداشت کیا۔ اپنے ماتحت لوگوں کو، کبھی بھی، بلاوجہ تنگ نہ کرتا، بلکہ انکے جائز مطالبات کو بسروچشم قبول کرتا۔

ان کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے، کئی بار خود ان کی جگہ، ڈیوٹی دینے کو تیار ہوجاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ماتحت تمام نوجوان، میرے ایک اشارہ پر، اپنے خون کا آخری قطرہ تک، بہادینے کے لئے تیار ہوجاتے۔ نہ کبھی خود اپنے افسرانِ بالا کے حکم سے عدول کیا اور نہ ہی حکم عدولی کی سزا موت تھی، جس پر میں نے کبھی عمل نہ کیا۔ کیونکہ اس غلام ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کے سینے میں ایسا دل اور ضمیر تھا، جن کے پاس حق خودارادیت بھی تھی۔

کسی وقت اگر کوئی ماتحت نوجوان میرا حکم نہ بھی مانتا، تو میں، ہنس کر ٹال جاتا تھا۔ یہ خیال کرکے کہ یہ لوگ غلام ہیں۔ مجبوریوں یا ضرورت نے، اگر انہیں اس موت کے کھیل میں جھونک دیا ہے، تو کیا ہوا! وہ بھی تو انسان ہیں! ان کا خون اور جانیں بھی اتنی ہی قیمتی ہیں، جتنی کہ ایک گورے صاحب بہادر کی۔

ارزانیٔ حیات
(زندگی کی بے قدری)

باوجود تمام وفاداری اور کام کی لگن کے، میں دو باتوں کی وجہ سے کافی حد تک متاثر اور دکھی تھا۔

۱ - انگریز بہادر کا ترجیحی سلوک، جس سے ایک ہی رینک(Rank) کے گورے اور کالے افسر کے مابین ایک بہت بڑی خلیج اور جانبدارانہ سلوک! جس کا شکار میرا ایک دوست اسکا ڈرن لیڈر سرندر سنگھ ہوا، اور وہ لقمہ اجل ہو گیا۔

ہوا دراصل یہ کہ ایک روز سرندر کو ایئر یا کمانڈر کی جانب سے احکامات موصول ہوئے، کہ فلاں بمباری جہاز میں فنی خرابیوں کی اطلاع کئی بار مل چکی ہے، جس کے ایئر ٹیسٹ کے لئے اس کو خود جانا ہوگا۔ سرندر تیار ہو کر آگیا، لیکن قدرے اداس تھا۔ اس کو شاید ماضی کے چند تجربوں کے تحت خدشہ تھا۔ جب وہ متعینہ سمت میں جہاز لے کر اڑا، تو تقریباً ۱۵ منٹ کے بعد اس کا رابطہ ہم سے ٹوٹ گیا۔ ۱۵ منٹ گزر جانے کے بعد دیکھا کہ خلیج بنگا پر سے ایک جہاز آرہا ہے اور یہ سرندر تھا۔ میدانی فوجوں کو اسکی حفاظت کے لئے باہر نہیں کیا گیا تھا۔ جاپانیوں نے نیچے سے فائر کر کے سرندر سنگھ کی ایک آنکھ اور آدھا چہرہ اڑا دیا تھا۔

۲ - دوسری بات جو میرے لئے تکلیف دہ تھی، وہ تھا بنگال کا قحط! ہزاروں جانیں روزانہ موت کا شکار ہو رہی تھیں جب کہ ہمارے سرکاری راشن اسٹوروں میں فالتو راشن (اناج) پڑا، سڑ رہا تھا۔ انگریز کو، ان، نذر اجل ہوتی ہوئی زندگیوں کی پرواہ نہیں تھی۔

ملیریا جیسی مہلک بیماری عام تھی۔ ہمارے دواؤں کے سٹوروں میں فالتو ملیریا کی جراثیم کش دوائیں کثرت سے تھیں۔ کئی پتھر دل، انسان نما، درندوں نے، کونین کی ایک ایک گولی، ایک روپیہ میں فروخت کی اور خوب پیسے بنائے۔ لیکن مجھے تو ایسے بے کس اور لاچار لوگوں کی حالت پر رحم آیا کرتا تھا۔

میں نے انگریز کی اس سنگدلانہ حرکت سے تنگ آکر راشن اسٹور میں سے چاول اور دال، چینی اور چائے نکال کر، ضرورت مند لوگوں میں مفت تقسیم کرنا شروع کر دیا اور ملیریا کش دوائیں بھی دے دیا کرتا تھا۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ اس عمل کی مجھے کیا قیمت ادا کرنا پڑی!۔

لیکن اس بیان میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ میں نے زندگی اور اس کی ارزانی (سستے پن) کو بہت قریب سے دیکھا۔ بے بس انسان! باوجود اپنے پاس پیسے رکھنے کے، اپنے لئے کچھ بھی خرید نہیں سکتے تھے۔ غیور بھائی، جو اپنی اور خاندان کی بھوک مٹانے کے لئے اپنی بتولہ بہن کی عصمت کو، دوسروں کی ہوس کا شکار ہونے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ میرا احساس تھا، جو، باوجود اپنے قبضے میں سب کچھ رکھنے کے دوسروں کے لئے، کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار میں اور پورن نے، سڑک سے دو بچے اٹھائے اور ان کو کیمپ میں لا کر، پورے چھ ماہ تک چھپا کر رکھا۔ جب اس وقت کے کمانڈر کو علم ہوا، تو اس نے ہم دونوں کے خلاف مقدمہ بنا دیا جو بظاہر ایک دھمکی تھی۔ میں اور پورن، ان بچوں کی زندگی بچانے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

لیکن ہوا یوں کہ ان بچوں کو، ایک فلاحی کیمپ میں مغربی بنگال کے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے وہ بچے بخریت ہوں اور بھی ممکن ہے کہ ان بچوں کے عزیز واقارب بھی مل گئے ہوں۔ لیکن ہمیں ان بچوں سے جو روحانی اور انسانی لگاؤ ہو چکا تھا! ان تمام جذبات کا گلا گھونٹنا پڑا۔

یہ گلہ ہے کہ یہاں زندگی کیوں سستی ہے
یہ ہے اِک تلخ حقیقت جو مجھے ڈستی ہے

مختلف تجربات

۱ - جہاں میں نے اس دور کے حاکم کے عہد میں کالے لوگوں سے گوروں کے غیر انسانی رویہ کا ذکر کیا ہے، وہاں اگر میں چند فرشتہ سیرت لوگوں کا ذکر نہ کروں، جن کے رویہ سے میری زندگی متاثر ہوئی، تو یہ ایک غیر اخلاقی بات ہوگی اور حقائق کی پردہ داری بھی۔

ایک نوجوان آفیسر ہمارے ۳۴۵ ونگ میں تبدیل ہو کر آیا، جس کا نام بکسٹر تھا۔ یہ ایک کم گو، بردبار، اور اپنے ماتحتوں کو پیار کرنے والا شخص تھا۔ اس کی طبعیت اور مزاج کا، آپ صرف اسی ایک واقعہ سے اندازہ کرلیں گے۔ ایک بار انڈین سٹاف نے مطالبہ کیا کہ ہم اپنا کھانا الگ پکوا کر کھائیں گے۔ نئے میس میں، بنیادی بات یہ تھی کہ نئے چولھے بنانا ضروری تھے۔ جب کہ جنگ کا زور تھا، تو وقت کسی کے پاس تھا نہیں، فیصلہ کے دوسرے دن، جب میں ورکشاب سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ مسٹر بکسٹر ایک کتاب کی مدد سے پکے چولھے بنانے کی کوشش کررہا تھا۔

اگر کسی لڑکے کو داڑھی بنانے کا وقت نہ ملتا تو صبح ناشتہ کے بعد بکسٹر بجائے اس نوجوان کو ڈانٹنے کے، اپنی ہی جیب سے، اس کو ایک بلیڈ نکال کر دے دیتا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ہر صبح ہمارے ساتھ ناشتہ کرتا اور اس کی موجودگی میں، اگر جاپانی جہاز بمباری کے لئے آجاتے تو وہ بجائے مورچوں میں پناہ لینے کے، سب نوجوانوں سے کہتا کہ " چلو! خدا سے دعا کرنے چلیں" یہ ایک ٹینٹ تھا، جس کو خدا کی عبادت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

دعا وہ خود کرتا تھا۔ ہمیں صرف "آمین" کہنے میں شرکت کرنا ہوتی تھی۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا۔ ایک دن بڑا سخت حملہ ہوا۔ جاپانی بمبار جہاز بڑی تعداد میں آئے۔ آج موت بڑی یقینی تھی۔

بکسٹر صاحب نے پھر وہی مشورہ دیا اور رورو کر دعا شروع کردی۔ وہ کچھ اس طرح سے دعا کررہا تھا " خداوند یسوع مسیح " تو آج اپنی قدرت کو ظاہر فرما ان نوجوانوں کے والدین اور عزیزوں کی خاطر، ان کو آج اس حملہ سے محفوظ رکھ تاکہ یہ نوجوان جان لیں کہ تو زندہ ہے اور نہ صرف انسانی جسم، بلکہ انسان کی روح کو بھی ہلاکت سے بچاتا ہے۔ اس روز ہمارے آس پاس کے کیمپوں میں بہت جانی نقصان ہوا تھا۔ میس کی ورکشاپ کی چھت کے ٹکڑے اڑ کر، ہمارے کیمپ کی سڑکوں تک آگئے تھے۔ پاس ہماری بڑی میس کے پیچھے سے، جو نالہ گزرتا تھا، سینکڑوں بمب اس میں گرے اور اس کی کیچ ابل رہی تھی، جس کے سبب سے، چاروں طرف دھواں اٹھ رہا تھا۔ نالے سے پاروالی ایک یونٹ سے جوانوں کے کراہنے کی، دل ہلادینے والی آوازیں آرہی تھیں۔، لیکن ہم محفوظ تھے۔ نہ صرف میں، بلکہ میرے علاوہ اور کئی لوگ بھی یہی اقرار کررہے تھے کہ بکسٹر صاحب کا یسوع "Lord Jesus Christ" سچ مچ زندہ ہے۔ سیدنا مسیح واقعی ہماری حفاظت کرتا ہے اور ہم انسانوں کی دعائیں بھی سنتا ہے۔

بکسٹر صاحب ہمیشہ ہر بات میں اپنے ایمان اور مذہب کو سامنے رکھتا تھا اور اگر کوئی ایسی اخلاق سوز بات ہوجاتی، تو صرف یہ کہتا، کہ مسیحی ہوتے ہوئے اس قسم کی حرکت میں تو کم از کم نہیں کرسکتا۔

۲ - ان ہی دنوں، راقم کو، یعنی مجھے بھی ایک حادثہ پیش آیا، جس کی نوعیت، سمرندر کے حادثہ سے ملتی جلتی تھی۔ جس کے نتیجہ میں میرے چہرہ کا کچھ دائیں حصہ جل گیا، اور آنکھ سمیت چہرہ، زخمی بھی ہوگیا۔ زخمی حالت میں مجھے ۵۲ انڈین جنرل ہسپتال پہنچادیا گیا

لیکن فوری مرہم پٹی کے بعد مجھے داخل نہ کیا جاسکا کیونکہ B.O.R.S" وارڈ پر دوروز پہلے بم گرا تھا۔

میں اسٹریچر پر ہی پڑا تھا کہ دو نرسز، ڈاکٹر کمانڈنگ آفیسر کے دفتر میں داخل ہوئیں، میرے بارے میں، انہوں نے دریافت کیا تو کمانڈنگ آفیسر نے انھیں بتایا کہ R.A.F کے لوگوں کو وہ، عام وارڈمیں داخل نہیں کرسکتا تھا۔ ان نرسوں میں سے ایک نرس نے کہا رینک زیادہ ضروری ہے یا جان ! گفتگو کی تفصیل مجھے یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ میں ایک نرس کوراٹر میں اکیلا تھا اور یہ لڑکیاں مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھیں، کیونکہ میری دونوں آنکھیں بند تھیں۔ پھر میری بند آنکھیں کھول دی گئیں اور چند روز بعد مجھے چھٹی مل گئی۔

جس روز مجھے ہسپتال چھوڑنا تھا، اس روز صبح سویرے یہ دونوں لڑکیاں ایک ساتھ میرے کمرے میں آئیں۔انہوں نے اپنے نام بتائے، جو " امبر" اور " میری " تھے۔ انہوں نے یوں کہا کہ "ہم نے تمہاری خدمت اس لئے نہیں کہ، کہ تم بہت خوبصورت ہو یا ہمیں تم سے، کسی قسم کا لالچ ہے! بلکہ صرف اس لئے کہ ہم مسیحی ہیں، اور ہمارے مالک (خداوند یسوع مسیح) نے، نجات دہندہ ہوتے ہوئے، تمام انسانوں کی، گناہ اور موت سے نجات کی خاطر، دکھ اٹھایا ہے اور یوں ہم پر بھی فرض ہے کہ ہم اپنے جیسے ہر انسان کی خدمت کریں۔"

اس مختصر تعارف نے تو میرا بہت بُرا حال کردیا۔ میں زار وقطار رورہا تھا، اور ایسے لگتا تھا کہ جیسے میں اپنے آنسوں کے سیلاب میں، خود ہی بہہ جاؤں گا۔انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ " رونا، تمہارے لئے ٹھیک نہیں، کہ ابھی آنکھ کا زخم کچا ہے" میری گردن، تشکر کے جذبات کے تحت جھک گئی اور دل چاہتا تھا کہ ان نیک دیویوں کے قدم چوم لوں۔ میں اس بات کا قائل ہوگیا کہ اس دھرتی کے سینے پر، ابھی خدا کے پیارے لوگ موجود ہیں، جو دوسروں کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

۳۔ کیمپ میں واپسی کے بعد مجھے ہلکا کام سپرد کردیا گیا۔ اور یہ کام، فوجیوں اور خصوصاً ایئر فورس کے لوگوں کو، ممنوعہ علاقے، جوشہر میں تھے، جانے سے روکنا تھا۔ چونکہ میری ڈیوٹی ایسی تھی اور میں اسٹاف پولیس کا نگران تھا۔ سو میری واقفیت، ایسے علاقوں میں رہنے والے لوگوں سے ہوگئی تھی۔

ہماری فیلڈ ورکشاپ میں ایک نوجوان ائیر مین " فلپ بدری ناتھ" تھا۔ یہ موجودہ ہندوستان کے صوبہ بہار کا رہنے والا تھا۔ جسکی موجودگی، ہم سب کے لئے تازگی کا سامان مہیا کرتی تھی۔ اکثر اوقات، کیمپ کے قوانین کی خلاف ورزی، اس صورت میں ہوجایا کرتی تھی کہ بدری کی صحبتوں میں اتنا لطف آتا تھا، کہ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ بدری کے نزدیک زندگی، ، ایک ہنسی کا نام تھا۔ میں چونکہ اپنے افسانہ " بھینٹ" میں بدری کے بارے میں کچھ کہہ چکا ہوں، اس لئے اب اصل واقعہ کی طرف آتا ہوں۔

ایک صبح جب میں نے بدری کو اس کی ایک دوسری ورکشاپ میں تبدیلی کے آرڈر دیئے تو بدری پر گویا بجلی گرپڑی۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو بدری نے بتایا کہ وہ ایک بازاری عورت، بنام کملا سے پیار کرتا تھا اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ میں نے سماج سے اتنی بڑی بغاوت کا سبب معلوم کیا، تو بدری نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

سر میرا دھرم (دین) بھینٹ (قربانی) ہے۔ پربھو(خداوند) یسوع مسیح نے مجھ جیسے پاپی سے پریم(پیار) کیا ہے، اور اپنی جان کی بھینٹ دے کر، تمام پاپی (گناہ گار) انسانوں کو مکتی (نجات وکفار) کا بندوبست کیا ہے۔ اگر پربھو یسوع مسیح، مجھ جیسے کو قبول

کرسکتا ہے تو میرا ابھی کام ہے کہ میں ان لوگوں کو بھی قبول کروں جو، پاپی ہیں، جن کو، دنیا پست خیال کرتی ہے۔

اسکے بعد جو کچھ میں کرسکا، وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نوجوان کی اتنی بڑی قربانی کے نتیجہ میں بدری کو واپس بلوالیا گیا۔ کیونکہ میں نے مسٹر بکسٹر کی وساطت سے کمانڈنگ کو سارے معاملہ کی اطلاع دے دی تھی اور بدی اور کملا کو کیمپ میں رکھ کر مقامی پادری سے ان کا نکاح پڑھوایا گیا۔ اور اسکے بعد بدری اور کملا، بدری کے گاؤں میں آگئے۔

ان واقعات نے میرے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا،

کہ سچی مسیحیت کس قدر بلند و بالا اور عظیم ہے،

بکسٹر کی عمدہ ترین، خاموش مسیحی زندگی،

"امبر اور میری" کا نیک اور پاک مسیحی سلوک

اور فلپ بدری ناتھ کی زندگی میں قربانی کا عملی نمونہ،

یہ سب باتیں مجھے ایک دوسری بہتر دنیا میں لے گئیں۔ جہاں میں نے انسان کو، ایک دوسرے سے سچا پیار کرتے اور پاک محبت کرتے اور ایک دوسرے کے لئے قربانی کا نیک اور مخلص جذبہ رکھتے ہوئے دیکھا۔

اعزازات خدمت

جنگ تو ۱۹۴۵ء میں ختم ہوگئی، مگر اب، برصغیر (ہندوستان) میں آزادی کی مہم نے زور پکڑا اور اس مہم کے علمبرداروں کی طرف سے تشدد اور آتشزدگی کی وارداتیں ہونے لگیں۔ ان کو دبانے کے لئے بھی فوج کی ضرورت تھی۔ اور اب ہندوستانی سپاہی اور افسر، اپنے ہی ہندوستانی مظاہرین بھائیوں کے سینے میں گولی داغ رہا تھا۔ میں کسی تنظیم میں باقاعدہ طور پر ملوث نہیں تھا۔ البتہ محکمہ سراغ رسانی سے منسلک ہونے کی وجہ سے جب کبھی مہاتما گاندھی صاحب یا محمد علی جناح صاحب سے ہمارے ہوائی اڈوں پر اترتے تو ہم بھی، ان کو پھولوں کے ہار پہناتے تھے۔

بکسٹر صاحب تبدیل ہو کر کسی اور جگہ جا چکے تھے۔ ایک دن شام کے کھانے کے بعد مجھے گرفتار کرلیا گیا اور الزام ظاہر کرنے سے گریز کیا گیا۔ دوسرے دن، ہند چینی کے ایک جزیرہ " بلا نکاماتی" پہنچا دیا گیا جو سنگھا پور میں واقع ہے۔ قیدی کیمپ میں ایک سکھ کرنل صاحب بھی تھے جو پوری سنگھ رجمنٹ لے کر جاپان سے جا ملے تھے۔

سردار صاحب نے میری آمد کی وجہ دریافت کی، جس کا مجھے علم بھی نہ تھا تو سردار صاحب انگریزوں کو گالیوں سے خراج عقیدت پیش کرنے لگے۔ کوئی ایک ہفتہ بعد میرے کاغذات بھی آگئے۔ تین الزامات تھے:

۱۔ یہ کہ۔ F.O چودھری فلاں دن فلاں وقت، ایک بنگالی کے ہاتھ راشن فروخت کرتے پکڑا گیا اور یونٹ کے چوکیدار گوکل کے سیٹی بجانے سے قبل ریوالور سے اس کو زخمی کردیا"

۲۔ دوسرا انعام یہ تھا کہ فلاں وقت فلاں روز F.O چودھری اور کارپول اسحاق نے مسٹر گاندھی کو ہار پہنائے تھے جب کہ وہ سرکاری وردی میں تھے۔

۳۔ تیسرا الزام یہ تھا کہ F.O چودھری اور ایس جی اسلم کو جناح صاحب کے سیاسی جلسہ میں تقریر کرتے سنا گیا اور ان کی تقریر میں بغاوت کا تاثر تھا۔

پہلے دو الزامات میں تو کچھ صداقت تھی کیونکہ میں بذاتِ خود اور میرے ہم خیال اور بہت سے لوگ تھے جو مہاتما گاندھی جی کی عزت کرتے تھے اور آزاد ہند کے حق میں تھے اور سباش چند بوس کی تحریک آزادی کے ساتھ اتفاق کرتے تھے اور راقم اب تک گاندھی جی سے بڑا لیڈر کسی کو نہیں مانتا، حالانکہ اور بھی کئی لوگوں نے آزادی کی راہ میں قربانیاں دی ہیں۔

راشن فروخت کبھی نہیں کرتا تھا، اور نہ لوگوں سے نقدی وصول کی کیونکہ اس کی نہ مجھے ضرورت تھی، اور نہ ہی میرے گھر والوں کو بھوک، گوکل چوکیدار کو زخمی کیا تھا کیونکہ ایک بار اس نے مجھ سے دودھ کے بیس ٹین مانگے تھے جو میں نے دینے سے انکار کردیا تھا۔ اسی لئے اس نے انتقام لینے کی غرض سے مجھے پکڑوانے کے لئے سیٹی بجانا چاہی تھی۔

سب سے آخر میں جو الزام تھا، جو بالکل بے بنیاد تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس جلسہ میں، میں اور سارجنٹ اسلم شامل تھے لیکن ہم تو ڈیوٹی پر تھے اور ہمیں جلسہ کی پوری کارروائی لکھ کر لانا تھی۔ یہ فیصلہ اسی روز چٹاگانگ ائرفورس اسٹاف میٹنگ میں ہوا تھا۔

کیمپ انچارج سردار صاحب نے تمام کاغذات پڑھ کر واپس کردیئے اور مجھے بھی، بجائے چٹاگانگ بیرک پور کے، قریب ایک گروپ میں بھیج دیا، شاید اوپر سے ہدایت ہی ایسی تھی۔ بہرحال ہم پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔

اب ۱۹۴۷ء کا آغاز تھا۔ بہار ایکشن کے بعد اب جنگِ آزادی، فرقہ ورانہ فسادات کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ایک روز ہمارے کیمپ کو بھی کانگریسی لوگوں نے آگ لگادی۔ ادھر پنجاب کے دیہات بھی اسی لپیٹ میں آچکے تھے۔

تمغہ خدمت

والد صاحب، جن کی تقلید میں، میں نے اس خونی کھیل کا آغاز کیا تھا کہ مفت میں دیس دیس کی سیر ہوگی اور اعلیٰ کارکردگی پر تمغہ خدمت الگے ملے گا، میری غیر موجودگی ہی میں فوت ہوگئے۔ اب والدہ اور بھائیوں کا اصرار، زور پکڑ گیا تھا کہ میں واپس آجاؤں۔

والدہ کی طرف سے خط و کتابت میرے بارے میں محکمہ کے ساتھ جاری تھی۔ اب میں خود بددل ہوچکا تھا۔ میں نے اپنا نام ریلیز کے لئے دے دیا۔ شرط یہ تھی کہ ریلیز کی درخواست کے دن، شروع کرکے پورے اٹھارہ ماہ، بغیر کسی فعال ڈیوٹی کے، رکھا جاتا تھا تاکہ میرے ٹریڈ کا شخص، اس عرصہ میں، تمام خفیہ کوڈز بھول جائے۔ اور سول زندگی میں اپنی تعلیم کو کام میں نہ لاسکے۔

لیکن خدا بھلا کرے گروپ کیپٹن ڈاکٹر عبد اللہ کا، جس نے میرے ضمن میں یہ شرط معاف کروادی، یہ کہہ کر کہ سائل کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اور میں اپنی ایک آنکھ کی بینائی کھو کر، اپنے کاغذات پر سرخ سیاہی کے نشانات کو بطور، تمغہ خدمت" ہاتھوں میں لے کر گھر آگیا۔ جس سے والدہ کو انتہائی رنج ہوا تھا۔

ایک ہی خواہش

الف۔ جہاد فی سبیل اللہ

زندگی کی بے مائیگی (مفلسی) اور موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے رب کو راضی کرلیں۔میں جب جموں پہنچا تو میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بڑے بھائیوں کو معہ بچوں کے گاؤں روانہ کردیا۔ کیونکہ مہاراجہ کشمیر کی نیت پر شبہ تھا کہ وہ کبھی بھی جموں کشمیر کو ایک خود مختار ریاست نہیں رہنے دے گا۔ وہ ضرور ہندوستان سے الحاق کرلے گا۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دوسرے دن مسلمانوں کا خون بہت ہی بے دردی سے بہایا جانے لگا۔ اردو بازار میں ایک دہی والے پہلوان کو دن دیہاڑے چھرا گھونپ دیا گیا۔ اگلے روز ہماری فیکٹری کا ایک چودہ سالہ الیاس مزدور کام پر نہ آیا، پتہ چلا کہ اس کی لاش گلی میں پڑی ہے۔ الیاس کو سپردِ خاک کرنے کے بعد میں نے تمام کاریگروں کا حساب چکادیا اور انہیں شام کی گاڑی سے سیالکوٹ شہر آنے کی تاکید کردی کیونکہ ان میں سے کوئی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر آنے پر رضامند نہیں تھا۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے ایک سکھ پڑوسی کے مشورہ پر تیاری کرلی۔ ستمبر کے آخر دریائے توی رات کی تاریکی میں تیر کر پار کیا۔ دوبارہ اپنی فوجی وردی پہنی اور ایک راستہ سے ہوتا ہوا۔ جہاں سے گاؤں صرف ساٹھ میل پڑتا تھا۔ خالی ہاتھ گھر پہنچ گیا۔ اب ہر مسجد سے یہی آوازیں آرہی تھیں کہ جہاد کے لئے تیار ہوجاؤ۔ یہ سب سے اعلیٰ خدمت ہے جو اللہ کو پسند ہے۔میں ابھی جہاد کی تیاری کرہی رہا تھا کہ اچانک سردار ابراہیم سے ملاقات ہوگئی اور انہوں نے مجھے اپنا ذاتی کارڈ دے کر، ہیڈ کوارٹر مجاہدین کشمیر بھیج دیا اور مجھے بطور مجاہد، بھرتی کرلیا گیا۔

سب سے پہلے مظفر آباد کی طرف سے بارہ مولا پر حملہ ہوا۔ تو میں بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اس میں شامل تھا۔ تقریباً دو ماہ تک اسی محاذ پر خون ریز جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر سردی بڑھ جانے کی وجہ سے، مجھے جنوبی محاذ پر بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی کئی معرکے ہوئے اور جس پلاٹون کے ساتھ میں تھا، اس کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو سڑک پٹھان کوٹ سے جموں کو ملاتی ہے، اس پر فوجی نقل وحمل کو بند کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اس سڑک پر قبضہ کیا جائے۔ جس کی کوشش جاری رہی اور کئی بار مار کھائی اور بہتیروں کو مارا بھی۔

ب۔ اہلِ کتاب

ایک روز میں نے ایک مولانا صاحب سے "کافر" کی تشریح طلب کی تو انہوں نے بتایا کہ:

"کہ جو شخص کلمہ گو نہیں، وہ کافر ہے۔"

میں نے پھر وضاحت چاہی کہ:

"عیسائیوں (مسیحیوں) کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

مولانا صاحب کی جانب سے جواب ملا کہ مسیحی "اہلِ کتاب" ہیں۔

میں نے اپنی الجھن کو ظاہر کرتے ہوئے پھر سوال کر ڈالا کہ: ابھی تو آپ کچھ اور کہہ رہے تھے اور اب آپ کتاب کو درمیان میں لے آئے ہیں، عیسائی تو کلمہ نہیں پڑھتے اور بقول آپ کے وہ کافر ہیں۔ مگر کافر کے لئے تو صرف دو ہی مقام ہیں۔ ایک "باب اللان" یعنی یہ وہ صورت، جس میں مسیحی، بیعت کرکے، اسلام میں پناہ حاصل کرلیتا۔ دوسرا "باب الحراب" یہ وہ صورت جس میں اسے جنگ کے لئے تیار ہوجانا چاہیے۔ مگر کیا مجھے اہل کتاب (یہودیوں / مسیحیوں)، کو کافر خیال کرنا مناسب بھی ہوگا، جب کہ ان کی بابت، اسلامی کتاب قرآن کی فیصلہ کن آیات میں تو یہ بیان ملتا کہ،

"کہہ اے محمد ! کہ (اے) اہل کتاب ، تم کچھ بھی نہیں ،
جب تک تم ، توریت اور انجیل پر عمل کرکے ان پر قائم نہ کرو۔"
"اہل انجیل (مسیحی لوگوں) کو انجیل کے مطابق فیصلے کرنے دیا کرو ،
جیسا کہ خدا نے ان کو انجیل میں حکم دیا ہے ، اور وہ لوگ کافر ہیں۔
جو اہل کتاب کے فیصلوں اور عدالت میں رکاوٹ اور رخنہ ڈالتے ہیں۔"
"یہ (یہودی اور مسیحی) وہ لوگ ہیں ، جن پر ہم نے الہامیٰ کتابیں ،
عدالت اور پیغمبری نازل اور مقرر کی --- یہ ہی (یہودی اور مسیحی) وہ لوگ ہیں ،
جن کو خدا نے راہنمائی دی اور ہدایت دی ہوئی ہے۔"
"اے (محمد) تم سے پہلے ہم نے روح اور وحی سے معمور لوگوں کو بھیجا ،
اور اگر تجھ (محمد) کو سمجھ نہیں آتی ، تو ان (یہودیوں اور مسیحیوں) سے دریافت کر۔"

بھلا وہ قوم جو خدا ، اسکے کلام ،اس کے فرشتوں ، اسکے نبیوں ، روز عدالت یعنی قیامت پر پختہ یقین رکھتی ، کیسے کافر ہوسکتی ، جب کہ اللہ (یہودی اور مسیحی) قوم سے بھی نیکی ، بھلائی اور اجرِ عظیم کا وعدہ کرتا ہے ، اور ان قوموں کو ان کے اپنے انبیاء کے علاوہ ، اور کسی نبی اور اسکی کتاب کے ماننے اور کسی دوسری نبی اور کتاب پر عمل کرنے کا بھی حکم ، اللہ نہیں دیتا !جس قوم کے لئے اللہ نے ، الہامی کتب ، عدالت ، پیغمبری ، اپنی روح اور اپنا کلام عنایت کیا ، وہ بھلا کیسے کافر ہوسکتی ! جس قوم کو اللہ نے روح اور وحی سے معمور کردیا ، کیا مجھے ، اس قوم کو کافر سمجھنا ، روا ہوگا؟ بلکہ یہاں تو ان لوگوں کو کافر کہا جارہا ہے ، جو اہل کتاب کے فیصلوں اور عدالت میں رخنہ ڈالتے ہیں ۔ اللہ تعالی ، تو بذاتِ خود ، پیغمبر اسلام کو یوں فرمارہے ہیں ، کہ تم اہل کتاب ، کچھ بھی نہیں ، جب تک کہ توریت اور انجیل پر عمل کرکے ان کو قائم نہ کریں۔ یہاں تو توریت اور انجیل کو قائم کرنے کا حکم صادر فرمایا جاچکا ہے۔ اگر اہل کتاب کفار میں سے ہوتے ، تو کیا واقعی اللہ تعالیٰ ، توریت اور انجیل کو قائم کرنے کا حکم دے سکتا تھا؟

مولانا صاحب میرے دلائل کو رد نہ کرسکے ۔ البتہ اتنا ضرور فرمایا کہ ،
" میں (مولانا) اس کی اجازت نہیں دیتا ، جو بھی آپ کی سمجھ میں آئے ، کریں۔

بس پھر کیا تھا! میرے ذہن میں ایک عجیب کشمکش شروع ہوگئی کہ جب کہ ہم مسلمانوں کی کتاب ، ان اہم قرآنی حوالوں کے مطابق ، مسیحی یا یہودی قوم کو کافر اقرار نہیں دیتی ، تو مولانا صاحب نے کیونکر قرآن سے ہٹ کر ایسا فیصلہ کرلیا۔

لیاقت نہرو پیکٹ (معاہدہ) عمل میں آچکا تھا۔ آزاد کشمیر فوج کی ہر طرح سے حوصلہ شکنی کی جارہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ان مجاہدین کی نقل وحرکت ، غیر آئینی خیال کی جارہی تھی۔ اس پیکٹ سے فائدہ اٹھا کر انڈین آرمی اپنی پوزیشن کشمیر میں مستحکم کرچکی تھی۔ مجاہدین اپنے محدود وسائل کے تحت جم کر نہیں لڑسکتے تھے ، سوائے چھپ چھپا کر ، شب خون مارنے کے۔

ایک رات معہ اپنے چند ساتھیوں کے ، ایک گاؤں میں داخل ہوا ، جسکے بارے میں خبر ملی تھی کہ ابھی تک اس گاؤں میں غیر مسلم ہیں۔ (اس سے پہلے کہ آگے بڑھیں یہ بتاتا چلوں کہ قلعہ ہسپتال کی فتح کے بعد مجھے کمیشن مل گیا تھا)۔ گاؤں بارڈر سے تھوڑی دور اندر تھا۔ میں نے نمبردار صاحب کو بلوا کر دریافت کیا: یہاں کوئی غیر مسلم ہے؟ صاحب ! کوئی ہندو تو نہیں ، البتہ ایک مسیحی خاندان ہے ، جواب ملا ! مسیحی ؟ یعنی عیسائی ؟ جی ہاں ! صرف تین افراد ہیں۔ خیر غیر مسلم تو ہیں۔ چلو! لے چلو ہمیں ان کے گھر ، آج ہم انہی سے -----

بیرونی دروازے کے بغیر ، ایک چار دیواری میں ایک کمرہ ، جو اندر سے بند تھا۔
دروازہ پر دستک دینے سے کھل گیا۔ آپ مسیحی ہیں؟ جی ہاں ہم مسیحی ہیں۔ کیا ابھی تک آپ مسیحی ہیں؟ کیا آپ مسلمان نہیں ہوسکتے؟

دو ادھیڑ عمر اشخاص میرے سامنے دیسی تیل کے دیئے کی مدہم روشنی میں کھڑے کانپ رہے تھے اور جواب کی تلاش میں تھے کہ اچانک چارپائی کے نیچے سے ایک کوئی دس سالہ لڑکی نکل کر سامنے آگئی اور دو ٹوک جواب دے دیا،

" ہم مسلمان نہیں ہوسکتے۔"!

مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا کہ: تم نے کسی سے مشورہ بھی نہیں لیا پھر بھی وجہ؟

" وجہ کچھ بھی ہو ہم مذہب نہیں بدل سکتے!"

بھولی بچی! آجکل جان بچانے کا سستا اور آسان طریقہ یہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔

"لیکن جس پر ہمارا ایمان ہے اس نے کہا تھا کہ

میں (سیدنا مسیح) دنیا کے آخر تک تمہارے ساتھ ہوں اور ہمارا ایمان ہے وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہے۔"

"اس نڈر بچی نے دلیری سے جواب دیا۔

اب مزید برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا: ٹھیک ہے! ہم ان دو بڈھوں کو تو ابھی ختم کردیں گے اور تمہیں کیمپ میں اپنے ساتھ لے جائیں گے تمہارے بدلے میں، ہندوستانی سے ایک مسلمان لڑکی حاصل کریں۔

" جو آپ لوگوں کی مرضی میں آئے کریں، لیکن صرف ایک درخواست ہے۔
ہم آپ سے زندہ رہنے کی بھیک نہیں مانگیں گے، صرف چند منٹ ہمیں دیدیں۔
تاکہ ہم دعا کرلیں، جس (مسیح) نے یہ وعدہ کیا ہے،
اس کو یاد دلادیں کہ وہ ہماری مدد کو آئے۔"

اس نوعمر بچی نے درخواست کے لہجے میں کہا۔
بے وقوف لڑکی! آجکل کوئی خدا کسی کو نہیں بچاتا۔ مسلمانوں کو سرحد کے اس پار کسی نے نہیں بچایا اور سرحد کے اس پر، ہندوؤں کا کوئی دیوتا نہ اپنے آپ کو نہ اپنے پجاریوں کو بچا سکا، وہ سامنے والے قلعہ ہسپتال کے مندر کو تم نے دیکھا نہیں، جس کو مسمار کرکے چند گھنٹوں میں ہمارے دو جتھوں نے زمین، بوس کردیا۔

" صرف چند منٹ کے لئے اجازت دے دیں۔"

اس چھوٹی بچی نے کہا۔ ہاں ہاں! تم کرلو دعا! نکال لو ایٹم بم دعا کرکے! بظاہر میں نے کوئی دعائیہ جملے نہیں سنے، اس لڑکی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے اور لب ہل رہے تھے، پھر تینوں نے، یک آواز میں، اپنی دعا کے اختتام میں یوں کہا:

"خداوند یسوع مسیح کے نام میں آمین!"

لفظ" آمین "کے ادا ہونے کے ساتھ ہی زمین سے ایک تیز قسم کی روشنی کی دیوار، ابھرنا شروع ہوگئی اور اس دیوار نے ان تینوں کو ہماری نظروں سے چھپادیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی تیز اور ڈراؤنی قسم کی روشنی کبھی نہیں دیکھی تھی، حالانکہ موت کی روشنیوں سے میں کھیلا کرتا تھا، لیکن یہ اپنی نوعیت کی واحد روشنی تھی جس کو میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ روشنی میرے زیادہ قریب ہوتی جارہی تھی اور میرا برا حال تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ روشنی آگے بڑھ کر مجھے بھسم کردے گی۔ میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اور میری رائفل۔۔۔؟ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا، کہ میں ان غریبوں سے معافی مانگ لوں، چنانچہ میں نے کہا، " ہمیں معاف کردیں۔" اور میری التماس کے جواب میں یوں آواز آئی کہ،

"ہم آپ کو خداوند یسوع مسیح کے نام میں معاف کرتے ہیں۔!"

اس جملہ کے ادا ہوتے ہی ، وہ آتشی دیوار ختم ہو گئی اور ہم کچھ لوٹ مار کے زیورات اور کچھ نقدی ان کی طرف پھینک کر، اس کمرہ سے نکل آئے۔ لیکن واپس پوسٹ پر جانے کے بعد، میں نہ سو سکا۔ " خداوند یسوع مسیح" کا نام بار بار میرے ذہن کے دریچوں پر حملہ آور ہوتا رہا۔

ج ۔ بکھرے دانے

۱ ۔ بکسٹر صاحب کا (Lord Jesus Christ) ، یاد آنے لگا، جس کی مدد سے میں اور میرے ساتھی جاپانی بمباری سے محفوظ رہے تھے۔

۲ ۔ امبر اور میری " کا یسوع مسیح" جس کے ایمان کے تحت انہوں نے ایک مجبور نوجوان کی جان بچائی اور خدمت کی۔

۳۔ فلپ بدری کا" یسوع مسیح" جس نے فلپ بدری کو اتنی بڑی قربانی دینے کی ہمت بخشی تھی۔

۴۔ اس کم سن مسیحی لڑکی کا" خداوند یسوع مسیح" جس نے بروقت آکر اس کو، اور اس معصوم بھولی مسیحی بچی کے خاندان کو بچالیا۔

یہ سب واقعات باری باری یاد آکر، ایسے یک جا ہونے لگے جیسے کوئی ایک ہی مالا کے دانوں کو بکھرا پا کر، ان کو دوبارہ ایک دھاگا میں پرو کر، اس کو مکمل کردے ۔ میں اس حد تک قائل ہوچکا تھا کہ یسوع مسیح ہی ، خدا کے مانند ، ایک زندہ ہستی ہے، جو اپنے نام لیواؤں کو بچاتا اور ان کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اس بعد کیا ہوا؟ اس کا مجھے علم نہیں۔

ایک رات میری پلاٹون نے کامیاب شبِ خون کا منصوبہ بنایا کہ ایک گاؤں کو، جو جموں ریاست کے کافی اندر تھا آگ لگادی ۔ میں خود اس راستہ پر ۔۔۔ایک کماد کے کھیت میں ، ایک کونہ پر کھڑا تھا، جو ریاست کے اندر کی طرف جاتا تھا۔ گاؤں میں مرتے ہوئے اور آگ میں جھلستے ہوئے لوگوں کی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی اور میں انتظار کررہا تھا کہ اگر کسی نے اس طرف آنے کی کوشش کی، تو میری گولی ہی اسکا موت کے لئے استقبال کرے گی۔

زبردست آتشی شعلوں کی چیرتی اور دھوئیں کو اپنے پلو سے دور کرتی ہوئی ایک کوئی ستر سالہ خاتون نمودار ہوئیں۔ کوئی ایک سالہ بچہ کو اپنے کندھے سے چمٹائے ہوئے تھیں۔ میں نے سوچا کہ گولی مارنا تو بیکار ہے۔ صرف رائفل کے بٹ کی ایک تگڑی سی ضرب ہی کافی ہو گی۔ جونہی خاتون کی طرف بڑھا اس نے بچہ میرے پاؤں پر پھینک دیا اور کہا کہ ، " مارو! پہلے اس کو مارو، یہ بھی ہندو کی اولاد ہے،

تمہارا اللہ لوگوں کو مارنے میں خوش ہوتا ہے۔"

اس لئے اس کو مارو"میرا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور اور میں سراسیمہ کھڑا رہ گیا۔ میری خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خاتون اور آگے بڑھیں اور مادرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر سوال کر ڈالا، کیا تمہارے بچے ہیں؟ نہیں اماں ! مگر بھائیوں کے ہیں میں نے جواب دیا۔ یہ بچے جب برسات کے دنوں میں گیلی مٹی کے گھروندے بناتے ہیں۔ تم نے کبھی ان کو بغور دیکھا ہے؟ ہاں اماں ! میں نے خود بھی بھی کئی بار مٹی کے گھوڑے ، بیل اور گھر بنائے ہیں اور اگر کوئی ان گھروں اور کھلونوں کو توڑڈالے تو کیسا لگتا ہے ؟ بہت دکھ ہوتا ہے اماں ! میں نے جواب دیا۔

بس بیٹا! یہی سمجھ لو کہ یہ انسانی زندگی بھی بھگوان (خدا) کی بنائی ہوئی مورتی ہی ہے۔ اور خدا کے ہاتھوں کا بنایا ہوا ایک کھلونا ، جو اس کی مہانتا (عظمت اور جلال) کو ظاہر کرتا ہے ۔ اگر تم کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی تمہارے ہاتھ بنائی ہوئی چیز کو بگاڑے تو تم یہ کیسے خیال کرسکتے ہو کہ بھگوان یا اللہ تمہارے ان خونی کاموں کو پسند اور قبول کریں گے ، جب کہ تم اپنے ہاتھوں سے اس کی انسانیت کو بگاڑتے ہو؟

کیا بھگوان اتنے ہی کمزور ہیں جو تم سے انسانیت کو قتل کرنے کی بھیک مانگتے ہیں کہ " کافر " کو مارو۔ اگر کوئی انسان یا کوئی چیز بھگوان کو پسند نہیں تو بھگوان تو خود بھی شکتی مان (قادر) ہیں، کہ وہ اس نا پسند انسان یا چیز کو، خود ہی ختم کرسکتے ہیں۔ بھگوان کو، تم لوگوں کو، کیوں کہنے کی کوئی ضرورت ہوسکتی، کہ تم خدا کی انسانیت کو محض کافر کا بہانہ بنا کرمار ڈالو؟ کیا تمہارے اپنے ایمان اور عقیدہ اور عبادت میں یوں نہیں کہ،

" جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا،
اس نے ساری انسانیت کو قتل کر ڈالا"؟

یہ الفاظ میرے دل ودماغ پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگے اور میں چلا اٹھا" اماں بس کرو! آج کے بعد یہ ہاتھ مذہب کے نام پر کسی پر انہیں اٹھیں گے۔
اماں میں سمجھ گیا ہوں کہ،

میں گمراہ ہوں۔"

مجروح انسان

میرے ہمدموں نے، مجھے زخمی کردیا
مجروح ہوکے، یاد کروں، چارہ جو کہ میں

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس بات یا اعتقاد کا قائل ہے ، یا جو خیال اس کے نزدیک قابلِ قبول ہے، وہی بات دوسروں سے منوائے، اور اگر بس چلے تو جبراً دوسروں پر اپنی بات اور عقیدہ کو تھوپنے کی کوشش کرے ۔اوریہی رویہ اور روش ، ایمان اور مذہب کے بارے میں انسانیت میں رہی ہے۔ لیکن ہم تو اس بات کے قائل ہوچکے ہیں کہ جیسے ایک انسان دوسرے انسان کی ناک سے مختلف ہے، ویسے ہی ہر انسان کے سوچنے کا انداز بھی دوسروں کی سوچ سے جدا جدا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے اس بیان سےدوسروں کو اختلاف ہوگا اور مذہب اور خصوصاً جہاد پر بہت کچھ کہنے اور بیان کرنے کے لئے احباب کے پاس ہوگا، لیکن اس ضمن میں ، میں (راقم) کسی بھی نکتہ چینی یاوضاحت کو، اپنے حق میں قبول کرنے کے لئے ہر گز تیار نہیں(راقم ، خود بھی مسلم ہوتےہوئے) اسی طرح اسلامی جہاد کا قائل تھا۔ مگر مسیحی ہونے کے بعد، مسیح کی پاک اور محبت اور ابدی معافی میں اسلامی جہاد کی قتل وغارت کو، ہم نے سرے ہی سے اپنے ایمان اور زندگی سے خارج کردیا) موجودہ مہذب دنیا کے کسی بھی شخص کو، اپنی رائے اور خاص کرمذہبی رائے، کسی دوسرے پر نافذ یا لاگو کرنے کا کوئی حق ہو ہی نہیں سکتا ۔ ہم نے قلم اس لئے نہیں اٹھایا کہ کسی کے ایمان ومذہب کی تذلیل کریں۔ اور نہ ہی ہم کسی کو یہ کرنے کی اجازت دینے کو تیار ہیں۔ بس جیسا ہم نے سوچا اور محسوس کیا، ویسا ہی فیصلہ بھی کیا۔ اسی طرح ہم نے مسیحیت کو محمدیت سے بھی پرکھا، اور

مسیحیت کا الہامی اور پاک اور عظیم ترین روحانی تاثر قبول کرکے ، اس زندہ اور سچے مسیحی ایمان ، کو سراطِ مستقیم کے طور پر، اپنی آخرت کی راہ، متعین کرلیا ہے۔

ہم نے تو اپنا آپ گریبان کیا ہے چاک
خود بھی سیا، سیا نہ سیا، پھر کسی کو کیا

اس رات اس بزرگ ہندو خاتون کے منہ سے ، ایسی باتیں سن کر، جب میں نے اپنے آپ کا محاسبہ کرکے دیکھا اور پرکھا ، تو یہ محسوس کیا کہ میرے جیسے شخص کے لئے۔ سوا دوزخ کے اور کوئی مقام نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے خدا کی صفت (اشرف المخلوقات) کو اپنے ہاتھوں سے بگاڑا (اسلامی جہاد کے نام پر قتل کیا) تھا، جس بشر کے لئے خدا تعالیٰ نے پوری کائنات کووجود بخشا تھا۔ مگر میں نے خدائے خالق کی اس مخلوق اشرف کو تباہ کردیا ہے۔ ہندو خاتون کی یاددہانی اب فیصلہ کن سی ہو گئی۔

جس نے ایک انسان کو قتل کرڈالا
اس نے تمام انسانیت کو قتل کرڈالا

پھر یہ خیال ذہن میں سر اٹھاتا ، کہ یہ سب کچھ میں نے خود نہیں کیا، بلکہ مجھ سے کروادیا گیا ہے۔ کیا میں نے اللہ اور پیغمبر اسلام اور قرآن کے حکم سے انسانیت کی قتل وغارت نہیں کی ؟ اس تمام خونی کھیل کا ذمہ دار کون ! اللہ یا محمد یا قرآن یا۔۔۔۔؟

جب خدا کسی انسان کو بناتا ہے، اور اس کو اسکی آزاد مرضی پر چھوڑدیتا ہے، تو پھر اس انسان کے نیک وبد اعمال کی بابت ، باز پرس کرنے کا، خدا کو کیا حق ہے؟ اور پھر اسے دوزخ کی دھمکی کیوں دیتا ہے؟ اگر کسی گناہ یا بدی یا قتل وغارت کو خدا ، ناپسند کرتا ہے، تو اسکے ارتکاب کی طاقت انسان کو کیوں دیتا ہے؟

جب میری محدود عقل نے میری کسی طرح سے بھی رہنمائی نہ کی اور میں کسی نتیجہ پر پہنچ نہ سکا تو میں نے خیال کیا کہ شاید خدا کا وجود ہی ایک واہمہ ہے اور مذاہب انسانوں کے خود ساختہ ہیں، جو لوگوں نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق ، انسانوں کو بے وقوف بنانے کے لئے مرتب کرلئے ہیں۔

لیکن ضمیر سے آواز آتی کہ نہیں ! بلکہ خدا ہے ۔ اور کائنات کا نظام اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی موجد اور ناظم ہے۔ اگر انہی حقائق کو کوئی مقام نہ ہوتا اور رب کا رشتہ اپنے بندوں سے، اپنے ہی کلام اور اپنی ہی روح کے وسیلہ نہ ہوتا تو یہ پوری کی پوری دنیا، اور ویرانہ ہوتی اور دنیا میں کوئی جاذیت نہ ہوتی۔

اب حالت یہ تھی کہ میں راتوں کو سو نہیں سکتا تھا اور سوچتے سوچتے جب تھک جاتا تو کبھی کبھی نیند آبھی جاتی۔ لیکن اب نہ تو وہ جوش تھا نہ ہی وہ ولولہ ۔ چند روز اپنی پوسٹ پر گزارنے کے بعد، میں اپنے کمانڈر سے ملا اور استعفیٰ پیش کردیا کیونکہ اب مزید خدمت میرے بس کی بات نہیں تھی۔

استعفیٰ پیش کرتے وقت جو بات چیت میرے کمانڈنگ کے مابین ہوئی اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں اور ممکن ہے وہ بعض احباب کی، دل آزاری کا سامان پیدا کرے، جو اپنا شیوا نہیں ،ورنہ بہت تفصیل سے بیان کیا جاسکتا ہے ۔ میں چونکہ کوئی تنخواہ غیر وصول نہیں کرتا تھا، اس لئے میں کسی کا پابند نہیں تھا، سو میں نے اس نام نہاد جہاد والی رضا کارانہ خدمت سے علیحدگی اختیار کرلی۔

ب ۔ رھبر ورھزن

اب میں ، اپنے آپ کو، ایک بھٹکا ہوا انسان ، محسوس کررہا تھا اور زندگی میں روشنی کوئی تھوڑی سی بھی جان باقی نہیں تھی ۔ میں نے کمانڈنگ کے مشورہ پر ایک خدمت قبول کرلی اور وہ یہ تھی کہ ہندوؤں کی املاک متروکہ (ترک شدہ جائیداد) کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ میرے ساتھ نیشنل گارڈ کے رضا کار ہوتے تھے اور ایک مسلمان دینی رہنما، جس کا نام میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔

ایک روز جب میں کھانا کھانے گھر آیا، تو میرے بھائی مرحوم حاجی خدا بخش نے میرے پاس ایک بہت ہی خوبصورت رومال دیکھا اور پوچھا : کہ رومال تم نے کہا سے لیا ہے؟ میں نے بتادیا کہ ہندوؤں کے سامان سے لیا ہے؟ بھائی صاحب نے رومال لے کر چولھے میں جھونک دیا اور کہا :" تم یہ رومال لے کر اپنا اور ہمارا منہ کالا کررہے ہو! تم اب گھر پر ہی رہوگے اور کل سے بیت المال کی ڈیوٹی پر نہیں جاؤ گے ! سنا تم نے ؟ مجھے حیرت ہوئی کہ بھائی صاحب نے ایک رومال کو تو میرے پاس برداشت نہیں کیا فلاں مولوی صاحب نے تو ہندوؤں کے مٹی کے چولھے تک اٹھوا کر اپنے گھر میں رکھوالئے ہیں۔

بلند شہر یعنی دیوبند میں یہ مولوی صاحب تو صرف تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے اور مجھے یاد ہے کہ والد صاحب اس کو دیو بند میں پیسے بھیجا کرتے تھے اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے خاندان کی کفالت میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔ لیکن ابھی اگلے روز ہی ایک افسر ضلع کی طرف سے آیا تھا تو مولوی صاحب اپنے کو، ہندوستان کا شہری بتارہے تھے اور کلیم فارم میں کافی آراضی لکھوائی تھی اور کئی مکانات کا بھی ذکر تھا۔ اس کلیم کے علاوہ، پاس کے گاؤں میں، ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد مولوی صاحب نے ایک بہت بڑی حویلی پر بھی قبضہ جمارکھا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ جب میں بہت چھوٹا تھا تو والد محترم نے مجھے ایک بار نصیحت کے طور پر یوں، مکینِ مساجد کی بابت کہا تھا کہ :

بیٹا سنو! یہ مولوی حضرات ، بس ہر طرح سے گمراہ ہیں۔ ان کی باتیں تو سنو لیکن ان کی پیروی مت کرو۔ منصور کو سولی چڑھانے والے یہی لوگ ہیں۔ ان کا احترام ضرور کرو لیکن ان پر بھروسہ ہر گز نہ کرو جہاں تک ممکن ہو، ایسے مذہبی لوگوں (مولوی یا قاری یا حافظ حضرات) کو اپنے گھر سے بہت ہی دور رکھو۔

یہ بات غالباً والد صاحب نے اسی وقت کہی تھی، جب ایک فرشتہ سیرت حافظ صاحب کو ایک مسجد میں سے کسی عورت کے ساتھ عین زناکاری کی حالت میں ، رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور والد صاحب نے اس وقت سے باجماعت نماز، ترک کردی تھی۔ وہ نماز تو باقاعدہ پڑھتے ، مگر تنہا۔

رہبر کے روپ میں مجھے کئی رہزن ملے
خود کو سنبھالوں یا بچاؤں آبرو کو میں

لا تقنطوا

۱ - روح کی فریاد

اب میرا مزاج چڑچڑا ہوچکا تھا اور دنیا کی ہر چیز کی طرف بیزاری کا سا عالم پیدا ہوچکا تھا۔ جو دوست میرے قریب بیٹھنے میں فخر محسوس کرتے تھے اب وہ دامن بچانے لگے۔ میری باتیں دوسروں کے ذہنوں کے لئے ناقابلِ قبول تھیں کیونکہ میں اپنے اسلامی مذہب اور اس مذہب میں موجود تمام گناہ آلودہ روایات یعنی توہم پرستی، قبر پرستی، مردہ پرستی، دھاگہ تعویذ اور جادوگری، دھوکہ، جھوٹ ومکاری، کثرت کی شادیوں کی آڑ میں زناکاری، قرآن کے مطابق عورتوں کے صلب شدہ حقوق، دیکھاوے کی نماز، مکاری کا روزہ، معاشرہ میں حاجی صاحب بننے کی غرض سے حج کرنے کی نیت اور لاوڈ سپیکر میں لوگوں سے واہ واہ! کی خاطر اعلان کے ساتھ کی زکواۃ، رشوت، سفارش، وقت اور مال کی چوری، جہاد کے نام پر قتل وغارت، دوسروں کے مذاہب کو ناچیز وحقیر جاننا اور ان کو گالی گلوچ دینا وغیرہ وغیرہ کو، ہو بہو سچائی کے ساتھ ہی بیان کردیا کرتا تھا اور میری سچی تجربے والی یہ باتیں، بیشتر لوگ رد بھی نہیں کرتے تھے، مگر چند لوگ مشورہ بھی دیتے کہ مذہب کی بابت گناہ گار گریباں کو چاک نہ ہی کیا جائے۔ مولانا مذہبی حضرات بھی میری نظروں میں ہرگز نہیں بھاتے تھے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ میں ہی لوگوں سے نفرت کرتا تھا یا لوگ مجھ سے بھی۔

البتہ اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے گھر اور باہر، اپنوں اور دوسروں کے لئے اجنبی تھا۔ مذہب کی بابت میرے آزاد خیالات کی وجہ سے، مجھ سے گھر کا کوئی فرد بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے گھر چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ اب میرا وجود سب کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا۔

مئی ۱۹۴۹ء میں، میں نے خاموشی سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اور کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ گرچہ کوئی منزل اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، لیکن ایک مقصد ضرور تھا، اور وہ مقصد یہ تھا کہ مجھے حقیقی سکون قلب مل جائے۔

کئی دوست احباب سے ملا، درگاہوں پر راتیں گزاریں، کئی درویشوں کی قربت اختیار کی لیکن جتنا زیادہ میں نے ان لوگوں کی قربت اور دیکھاوے کے درویشوں اور نام نہاد خدا رسیدہ ہستیوں کی نزدیکی اختیار کی، مجھے سوائے مایوسی کے کچھ نہیں ملا۔ میری ملٹری کی تربیت کچھ ایسے ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ میں ہر شخص پر آسانی سے یقین بھی نہیں کرتا تھا۔

میں ہر درویش اور فقیر کا جب بغور مطالعہ کرتا تو پتہ چلتا کہ یہ لوگ تو خود راہ اور حق اور زندگی کی تلاش کے دعویدار ہوتے ہوئے بھی گمراہ ہیں۔ میں نے ان اصفیاء (چنے ہوئے پاک دل بزرگ) اور فقراء کو ایسی ایسی گندی وغلیظ قسم کی عادات میں مبتلا پایا کہ بیان کرتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتا ہوں۔ گدی نشینوں کی طرف پلٹ کر دیکھا تو ان کا اس سے بھی بدتر حال دیکھ کر دلی دکھ ہوا۔

سید زادوں اور نجانے کیا کیا زادوں کے غلاموں جیسے مزارعین توفاقے کررہے ہیں اور خود سید حضرات روس کے ملک سے بذریعہ ہوائی جہاز، کتوں کی جوڑیاں منگوارہے ہیں۔ اور جو لوگ ان زادوں کے کھیتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کردیں، ان کے بچے ایک گھونٹ دودھ حاصل نہ کرسکیں، لیکن ادھر سید زادوں کے کتوں کو دو وقت تازہ گوشت مل رہا ہے۔

اپنے ہی مذہب کی ان تمام گناہ آلودہ حرکات کے مشاہدات نے مجھے ذہنی طور پر مفلوج کرکے رکھ دیا اور اب میں نے براہ راست بہت سویرے اٹھ کر خدا تعالیٰ سے دعا کرنا شروع کردیا۔ یہ دعا حاکم اور روح کی پکار اور فریاد زیادہ تھی۔

میری دعا ان الفاظ میں زیادہ تھی۔

" رب باری ! تیری ذات سے انکار ناممکن ہے
میری رگ وریشہ سے تیری ذات باری کا ظہور ہے۔
پوری موجودات تیرہی ذات کی مظہر ہے۔
میں مانتا ہوں کہ تونے مجھے اور تمام انسانوں کو بنایا،
میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے رہبرانِ بے ایماں
کی تقلید کرکے ان کے تباہ کن مشوروں پر عمل
کرکے تیری ہی بنائے ہوئے انسانوں کو
ستایا اور جہاد کے نام پر مارا، اور قتل وغارت کی ہے۔
میری بد اعمالیاں یہ بتاتی ہیں کہ میرا حصہ دوزخ ہے،
کیونکہ اے میرے مالک تو تمام گنہگاروں کی عدالت کرے گا،
مجھے اپنے موجودہ مذہب اور عقیدہ پر مزید اعتمار نہیں رہا ہے۔
اے میرے خالق اور آقا ! تو مجھے صراط مستقیم دکھا،
اسلئے کہ میں دوزخ میں نہیں جانا چاہتا
اگر تونے مجھے صراط مستقیم نہ دکھائی،
اور میں اسی حالت میں دنیا سے اٹھ گیا
تو تجھے کوئی حق نہیں کہ تو مجھے دوزخ میں جانے کا حکم دے
میں جہنم میں بھی جانے سے انکار کردوں گا
اگر تو زندہ اور راست ہے تو مجھے اپنی راہ دکھا
کہ میں تیرے دیدار کو حاصل کرسکوں،
میں دکھی ہوں میرے مالک اور خداوند !
میں سکونِ قلب کی خاطر مارا مارا پھر رہا ہوں۔
میری مدد کو آ، اے میرے خالق وآقا !
مجھ کو میرے گناہوں کے احساس کے نشتر زخمی کررہے ہیں،
مجھ پر اپنے پاک فضل کی نظر کر، مجھ گناہ گار پر رحم کر!
اپنے پاک کلام اور اپنی پاک روح میں مجھ کو لے لے !
راہ اور حق اور زندگی ظاہر کرنے والے پاک آسمانی خدایا! رحم کر۔ آمین۔

ب۔ سراغِ منزل

تاریخ تو اب یاد نہیں لیکن یہ صبح کے تین یا چار کا وقت ہوگا۔ میں حسبِ عادت فریاد اور دعا کررہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری تھا۔ آج میں معمول سے زیادہ رنجیدہ تھا۔ یہ کمالیہ ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ تھا۔ اچانک میری پچھلی طرف آکر، کسی نے میرے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا:

" میرا فضل تیرے لئے کافی ہے"

یہ جملہ تین بار دھرایا گیا اور تیسری بار میں نے اپنے جسم میں برقی لہر کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا اور میرے ذہن اور دل پر جو بوجھ تھا وہ ایک دم سے دور گیا۔ میری روح گویا زندہ ہوگئی اور مجھ پر کیف وسرور کی سی عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور میں وجد کی حالت میں یہی جملہ بار بار دھرانے لگا۔

" میرا فضل تیرے لئے کافی ہے"

میرے بینچ کے قریب ہی ایک ریلوے کا ملازم صفائی کررہا تھا جو مجھے اس حالت میں دیکھ کر رک گیا اور میرے قریب آکر بولا:

" کاکا ! توں عیسائی ایں"؟

میں نے نفی میں سر کو جنبش دی اور اس نے حیرت زدہ ہو کر مجھ سے پوچھ ڈالا، تو پھر تم یہ مسیح کی پاک انجیل کے الفاظ کیوں بار بار کہہ رہے ہو؟

" میرا فضل تیرے لئے کافی ہے"

بزرگ بابا جی ! میں نہیں جانتا کہ میں کیوں یہ فقرہ بار بار کہہ رہا ہوں۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ ابھی ایک نیک پاک الہیٰ ہستی نے مجھ سے یہ الفاظ کہے تھے، اور غالباً چند تختیاں بھی دکھائی تھیں، جن پر میری تمام بد اعمالیاں کندہ تھیں۔ لیکن ان گناہ سے بھری تختیوں کو اس نیک اور پاک الہیٰ ہستی نے اپنے پاک ہاتھوں سے اپنے ہی پاک خون کے وسیلہ، صاف کر دیا تھا۔ اس وقت سے میں ایک نیا بشر ہوں، میری روح کا سارا بوجھ اتر گیا ہے، میرا دل کچھ گانے کو چاہتا ہے۔

اس بزرگ آدمی نے مجھے بتایا کہ ، خداوند کا شکر ہو بیٹا ! یہ جو پاک و نیک الہیٰ ہستی تیرے پاس آئی تھی وہ " مسیح " تھا۔ یہی الفاظ مسیح نے مقدس پولوس رسول سے بھی کہے تھے، جب مسیح ، ساؤل یعنی پولوس پر ظاہر ہوا تھا اور یہ سچا واقعہ انجیل پاک میں لکھا ہوا ہے۔

اب سیدنا مسیح یہ چاہتا ہے کہ تم اسکے نیک و پاک بندے بن جاؤ!۔ اس بزرگ نے مجھے مشورہ دیا۔ مگر وہ کس طرح بابا جی ؟ میں کس طرح مسیح کا وفادار بندہ بن سکتا ہوں؟ بابا جی نے مجھے بتایا، کہ میں اپنے گناہوں کا مسیح کے سامنے اقرار کروں، اپنے گناہوں سے توبہ کروں اور ان تمام گناہوں کو ترک بھ کروں۔ سیدنا مسیح کے خداوند اور مسیح ہونے کا اقرار کروں۔ اور یہ اقرار کروں، کہ مسیح میرے گناہوں کے لئے ، پاک نوشتوں کے مطابق، صلیب پر قربان ہوا، مر گیا اور دفن ہوا۔ اور پھر خدا کی پاک روح کی قدرت سے مردوں میں سے زندہ ہوا۔ اور اب مجھے اسی مسیحا کے مردوں میں سے زندہ ہونے کی گواہی دینا ہے۔ مسیح کے نام میں بپتسمہ لینا ہے اور پاک انجیل کے تمام احکامات کے مطابق، مسیح کے پیچھے چلنا شروع کرنا، اور آسمان کی بادشاہت اور خدا کی راست بازی کی منادی بھی کرنا ہے۔ مگر بابا جی ! مجھے وضاحت سے بتاؤ کہ میں ابھی کیا کروں اور کہاں جاؤں، کس سے ملوں ؟ مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اب مجھے منزل مل گئی ہے؟

اس بزرگ بابا نے مجھے بتایا کہ " میرے بیٹے! تم اب یہاں سے تاندلیا نوالہ جاؤ تو وہاں سے عیسیٰ نگری چلے جانا جہاں پر ایک پادری صاحب ہیں، جن کا نام پادری عنایت رومال شاہ ہے اور وہ تمہاری مدد کریں گے ۔" اب یہ بزرگ جھاڑو چھوڑ کر آبدیدہ ہو کر، میرے اور قریب آگئے اور میں نے انہیں اپنی بانہوں میں بھینچ کر گلے لگالیا اور دونوں نے خوب رو کر دل کی بھڑاس نکالی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ اسی بچی کا باپ ہو جن کو مارنے کے لئے میں اور میرے ساتھی گئے تھے۔ مگر ان کو جنابِ مسیح نے بچالیا تھا۔

سرِ راہ

تھی وہ اک درماندہ، راہ رَو کی، صدائے دردناک
بھول سے جس کو، رحیل کارواں سمجھا تھا میں

الف۔ راہوں کے کانٹے

دل وذہن پر سے مایوسی اور نا امید کے بادل چھٹ جانے کے بعد جب میں تاندلیا نوالہ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر عیسیٰ نگری چک ۶۲ ۴ سمندری پہنچا تو بزرگ پادری عنایت رومال شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بڑے تپاک کے ساتھ مجھے قبول کیا۔ اپنے دفتر بٹھا کر کھانا کھلایا۔ بعد میں مجھ سے سوال کیا اور زیرِ لب مسکرادیئے۔

" برخودار! تم کیوں مسیحی ہونا چاہتے ہو؟"

کسی نے مجھ سے کہا کہ میں مسیحی ہو جاؤں ۔ کل رات یعنی آج صبح سویرے قریب تین چار بجے، مسیح مجھ سے خود ملا ہے۔ اور اس نے خود کہا ہے کہ " میرا فضل تیرے لئے کافی ہے" میں نے جواب میں کہا:

پادری صاحب نے میرے ایمان کو آزمانے کی غرض سے پوچھا کہ " لیکن مسیح کے تو لوگوں نے کپڑے بھی اتار لئے تھے، اس کو کوڑے مارے، منہ پر تھوکا، گالیاں دیں، لعن طعن کیا گیا، اور انسانیت کے گناہوں کی خاطر کفارہ کی موت بھی مر گیا اور تیسرے دن مردوں میں سے زندہ ہوا۔ وہ تو ایک حلیم ہستی تھی۔ مسیح سے تم کیا توقع کرتے ہو؟ یہ دیکھو سامنے والی تصویر کو! پادری صاحب نے (دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا۔ پادری صاحب! یہ مت کہیئے، مسیح کی اس عظیم اور حلیم ہستی نے تو مجھے سب کچھ ہی دے دیا ہے، اس نے مجھے ایک نیا انسان بنادیا ہے اور مجھے سکون قلب (دلی سکون) مل گیا ہے۔

پادری صاحب نے کچھ دیر سوچ کر کہا، کہ "اچھا تو میں یہ کرتا ہوں کہ تمہیں گوجرہ میں ایک مشنری دوست کے پاس بھیج دیتا ہوں، آگے وہ تمہاری مدد کریں گے۔" چند لمحوں کے بعد مجھے ایک خط تھمادیا گیا اور نوآنے کی رقم مجھے دی، تاکہ میں سمندری سے بس میں سوار ہو کر گوجرہ چلا جاؤں۔

بعد از دوپہر میں گوجرہ آگیا، مشنری پادری وٹن صاحب سے ملا، پادری صاحب نے مجھ سے کہا کہ پہلے ہم تمہیں آزمائیں گے۔ اس کے بعد، آپکے بپتسمہ کا فیصلہ ہوگا۔ میں نے بخوشی اسے قبول کرلیا۔ اس کے بعد مجھے ایک مسافر خانہ دکھایا گیا، جس کی کل کائنات دو لحاف اور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی تھی۔ اگر لحاف اوڑھتا تو گرمی ستاتی اور اگر لحاف اتارتا تو مچھر حملہ آور ہو کر میرے سرخ خون کی ضیافت اڑاتے۔ کھانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا۔ اگر کسی صاحب نے دے دیا تو کھالیا اور اگر کسی کو خیال نہ آیا، تو فاقہ۔

ایک مرتبہ کوئی تین روز تک کسی کو مجھے کھانا دینے کا خیال نہ آیا تو میں بھوک سے نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑھ گیا۔ آخر ایک روز صاحب بہادر خود میرے سیاہ خانے میں تشریف لائے اور پوچھا:

بھائی جی! کیا بیمار ہیں آپ؟ نہیں صاحب! بیمار تو نہیں ہوں۔ آپ اتنے کمزور کیوں لگ رہے ہیں؟ کھانا وغیرہ کھایا ہے؟ میں نے نفی میں سر ہلایا تو پھر پوچھا، کتنے روز سے؟ بات کرنے کی قوت تو جواب دے چکی تھی، لیکن آنسو نہ جانے کیوں اور کہاں سے آنکھوں میں اتر آئے۔ میں نے انگلیوں کے اشارے سے بتانے کی کوشش کی تو وٹن صاحب سمجھ گئے کہ تین روز فاقہ سے ہوں۔

وٹن صاحب میری چارپائی کے پاس بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور کہنے لگے: کہ ہم لوگ کتنے کمینے ہیں، کتنے ظالم! میں تو یہاں تھا نہیں، لیکن احاطہ کے لوگوں میں سے کسی کو بھی خیال نہ آیا کہ تمہیں کھانے کے لئے پوچھ لیتا۔

کوئی بات نہیں صاحب! میں نے کہا کہ شاید یہ بھی میرے امتحان کا ایک حصہ ہے، اس لئے میں نے کسی سے نہیں کہا، نہ ہی باہر نکلا ہوں، کیونکہ احاطہ کے لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ نوجوان ضرور کسی چھوکری کے پیچھے عیسائی ہورہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسے ملازمت کی ضرورت ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسے پیسے کا لالچ ہے۔ میں سب کچھ سنتا ہوں مگر خاموش ہوں۔" اچھا اب اٹھو اور میرے ساتھ گھر پر چلو۔"

مجھے سہارا دے کر وٹن صاحب اپنے گھر لے گئے اور خانساماں سے کہ " میں گھر پر رہوں یا نہ وہ کھانا بنا کر مجھے کھلادیا کرے۔" یہ تو صاحب بہادر کی مہربانی تھی، ورنہ احاطہ کے لوگوں کو یہ بھی پسند نہیں تھا۔ دوروز کے بعد ہی باتیں شروع ہو گئی تھی کہ،" بس جی! مکھن روٹی مل جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔"

میں نے حالات کو بھانپ کر، صاحب بہادر سے کہا کہ میرے رہنے اور کھانے کا انتظام آئیور ہوسٹل(بورڈنگ ہاؤس) میں کردیں کیونکہ لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس احاطے میں کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہے۔

جون کے مہینہ میں، اسکول اور بورڈنگ بند ہوجایا کرتے تھے لیکن میرا انتظام ایک برادر سیوک بوٹا مسیح کے سپرد کردیا گیا اور ساتھ ہی چوکیدار کی ملازمت کی بھی پیشکش کی گئی جو میں نے بخوشی قبول کرلی کیونکہ میں کسی پر بوجھ بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔

سیوک بوٹا مسیح، نہایت دعا گو اور حلیم الطبع انسان تھا۔ جس کی رفاقت میرے لئے روحانی ترقی کا باعث تھی۔ مسیحی عملی زندگی اور مسیحی ایمان کے سادہ رموز، میں نے انہی سے سیکھے۔ سیوک صاحب صرف گورمکھی زبان پڑھ سکتے تھے اور لڑکیوں کے اسکول یا بورڈنگ میں بطور چپراسی کے کام کرتے تھے اور اپنی قلیل آمدنی پر قانع تھے اور اسی سے میرے جیسے لوگوں کی بھی مدد کرتے تھے۔ اب اگر ان باتوں کی تفصیل سے بیان کیا جائے جو میرے متلاشی ہونے کے زمانہ میں مجھ پر گزریں تو میں شکوہ کی حدود میں داخل ہوجاؤنگا۔

غم نہ، یہ دنیا ہے، سب الٹے، اس کے دھندے ہیں
شکوہ زبان پر لا نہیں سکتے، جو کہ حق کے بند ہیں

اختصار کے ساتھ یہ بیان کردینا کافی ہوگا کہ مشن احاطوں کی مسیحی دنیا الگ ہی ہوتی ہے۔ گرجاگھر سے قریب رہنے والے لوگ، گرجاگھر سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں اور صاحب کی خوشامد اور حاضر باشی (موجودگی) ان کی زندگیوں میں خلوص کی بجائے ریاکاری کو بھر دیتی ہے اور یہ غریب لوگ اسی چکر میں اپنی عمر عزیز گزاردیتے ہیں اور حقانیت کو زندگی بھر نہیں پاسکتے۔ حالانکہ باہر (اسلام یا کسی اور دین) سے، مسیحیت میں آنے والے لوگ، ان ہی کی آنکھوں کے سامنے، قرب خداوندی حاصل کرکے مسیح سرشاری اور راحت حاصل کرلیتے ہیں، جس کے لئے انہوں نے اپنی مادی دنیا کو پھونک کر، زندگی میں ایک نہایت ہی سنجیدہ فیصلہ کیا تھا۔ ان لوگوں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مگر غربت انسان کو کمینہ بھی بناسکتی ہے، اس میں، ان کا قصور کم ہے۔

ستمبر ۱۹۴۹ء کے آخری دنوں میں مجھے بتایا گیا کہ میرا بپتسمہ اکتوبر کی ۲ تاریخ کو ہوگا، جب گوجرہ (ضلع لائیلپور، موجودہ فیصل آباد) کا پہلا اجلاس ہوگا۔ بپتسمہ سے پہلے مجھ سے کئی سوالات پوچھے گئے، کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ کتنی اور کون کون سی پڑھی غالباً وٹن صاحب کی اردو کی پوری الماری اور کچھ انگریزی کی کتابیں بلااجازت پڑھی تھیں۔

(بپتسمہ ,Baptism) سے مراد، پانی میں ڈالا جانا ہوتا، جو سیدنا مسیح کی موت، مسیح کے دفن ہونے اور مسیح کے مردوں میں سے زندہ ہوجانے کی عین مشابہت ہے۔ انسان خدا کے سامنے اپنے گنہگار ہونے کا اقرار کرتا اور سیدنا مسیح کو اپنا شخصی نجات دہندہ قبول کرتا اور اس موجودہ گناہ آلودہ، دنیا کو ترک کرکے مسیح کے ساتھ ایک طرح سے پانی میں دفن ہوتا، اور جب وہ پانی سے باہر نکلتا، تو گویا وہ گناہوں کے باعث مردہ حالت سے زندہ ہوتا اور راستبازی کے اس قدم کے بعد وہ مسیح اور اس کے پاک خون سے خریدی گئی، پاک کلیسیاء

کے ساتھ زندہ رہے گا)،(متلاشی اور نو مرید مسیحی کے لئے لفظ بپتسمہ کی بابت ایک اہم مگر بنیادی خیال)۔

ستمبر کی ۳۰ تاریخ کو جب میں دعا کررہا تھا تو خداوند نے میرے ضمیر کو بیدار کیا اور بتایا کہ اب تک میں نےوٹن صاحب کو اپنا حسب ونسب نہیں بتایا۔ گویا اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ یہ بزدلی یا فریب دہی ہے۔ یہ بھی تمہاری راہوں کا کانٹا جس کو ہٹانا ہے۔ میں اسی وقت رات کو اٹھ کر صاحب بہادر کے پاس گیا اور اپنے آپ کو اصلی صورت میں پیش کیا، جس سے انہیں بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے میرے ساتھ مل کر، جنابِ مسیح سے دعا کی۔

۲۔اکتوبر کو میرا بپتسمہ ہوگیا، اور مجھ پر " مسیحی" ہونے کی مہر لگ گئی۔ میں بہت خوش تھا، کہ اب تومیں سیدنا مسیح کے پاک نمونہ (راست بازی کو پورا کے مطابق) بپتسمہ بھی لے لیا ہے۔ اب تمام راہیں صاف اور ہموار ہوگئی ہیں۔ اب تومیں مسیحی برادری کا ایک رکن بن گیا ہوں۔ اب یہی میرے لوگ ہیں اور میں مسیحی خاندان کا فرد ہوں۔ اور اپنے سیدنا مسیح کا گواہ ہوں۔

ابھی میرے بپتسمہ کو دوہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ میرے بڑے بھائی صاحب میری تلاش میں گوجرہ آگئے۔ اس روز نہ تو ماسٹر چرن داس نہ ہی وٹن صاحب اور نہ ہی پادری بی۔ ایم آگسٹین صاحب تھے۔ غالباً یہ سب لوگ کسی اہم مشن میٹنگ پر، گوجرہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میرے بڑے بھائی نے میرے سامنے دو راستے رکھ دیئے۔

۱۔ پہلا تو یہ کہ میں بلا کسی تامل کے، ان کے ساتھ چل دوں اور کسی کو نہ بتاؤں کہ میں کہاں جارہاں ہوں۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ کہ انکار یا عدم تعاون کی صورت میں، وہ شہر جا کر یہ خبر عام کردیں اور بلوا کرکے، گوجرہ کے تمام مسیحیوں کو میرے ساتھ پٹوائیں گے۔ میں نے صرف اپنے بڑے بھائی صاحب سے یہ کہا کہ ،پہلے میں ، اپنے آقا ومالک سیدنا مسیح سے پوچھ لوں۔ میں نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کرکے اپنے آقا ومولا سیدنا مسیح سے دریافت کیا۔ تو خدا کی پاک روح نے مجھ پر ظاہر کیا کہ ، " ابھی اور بہت سے کانٹے ہیں جن پر سے گزر کر تمہیں میرے پیچھے آنا ہے۔ تم اسکے ساتھ چلے جاؤ۔ سب سے پہلے تمہیں اپنے ہی خاندان سے میری گواہی کا شروع کرنا ہے۔ کیونکہ پہلے یروشلیم پھر یہودیہ ، پھر سامریہ اور پھر پورے عالم میں تم کو، میرے گواہ بن کر کھڑے ہونا ہے۔" میں نے خالو سے کہہ دیا کہ میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

لائل پور(فیصل آباد) میں آکر کسی گلی میں زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کو مجبور کیا گیا۔ مگر میں نے شکر کرکے کھالیا۔ اسکے بعد میرے بڑے بھائی مجھے ضلع شیخوپورہ میں لے آئے۔ جہاں ہر روز ایک تازہ مولوی کو میرے مدِ مقابل لایا جاتا۔ ہر مولوی، بمشکل چند منٹ بات چیت کرکے یا تو اپنی شکست تسلیم کرلیتا یا پھر میرے پاگل ہوجانے کا تصدیق نامہ دے کرچلاجاتا۔

یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ میری ملاقات سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب سے کروائی جائے۔ چونکہ شاہ صاحب ان ہی دنوں شیخوپورہ تشریف لانے والے تھے۔ وقتِ مقررہ پر مجھے شاہ صاحب کے حضور میں پیش کردیا گیا۔ تو بجائے اس کے کہ شاہ صاحب مجھ سے کوئی مذہبی قسم کی بات کرتے، وہ زور زور سے ہنس کر پوچھنے لگے،

" تم مسیحی ہوگئے ہو؟"جی ہاں ! میں نے مختصر جواب دیا۔ کچھ اور فرمائیے شاہ صاحب ! میرے لہجہ میں نرمی اور اضطراب تھا۔ اور کیا کہوں؟ شاہ صاحب نے حقارت سے کہا۔ مزید کوئی نصیحت وغیرہ! میں نے التجا بھرے اندازے میں کہا۔ نصیحت کیا ؟ یہی ایک وجہ ہے جس کے لئے لوگ عیسائی ہوتے ہیں۔ اب مجھ میں مزید صبر کرنے کی ہمت

نہیں تھی، اس لئے میں نے اپنے غم وغصہ کو چھپاتے ہوئے کچھ کہنے کی اجازت چاہی اور ان صاحب کو یوں جواب دیا۔

شاہ صاحب ! میں تو بڑی آرزو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ آپ ہی مجھے کسی صراط مستقیم پر ڈال دیں گے لیکن آپ کے بزرگ چہرہ سے ایسی گھٹیا گفتگو کی امید نہ تھی۔ آپ کی طرف سے مجھے بے حد نا امیدی ہوئی ہے۔ مزید میں یہ بھی عرض کردوں کہ جنس اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو شخص جنسی لذت کی خاطر مذہب اور ایمان جیسی مقدس چیز کو رد یا قبول کرتا ہے وہ تو سراسر احمق ہے۔ شاہ صاحب ! مزید آپ کی اطلاع کے لئے آپ کو بتادوں کہ میں مسلمان رہ کر کم از کم چار اور اگر مقدور ہو تو سنت محمد عربی کی طرح اس سے بھی زیادہ عورتوں سے شادی کرکے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ اور اگر مرد مومن کی موت مرنا تو مجھے بے شمار حوریں مل سکتی تھیں۔ (سورۃ رحمٰن آیت ۷۱ تا ۷۲)۔

شاہ صاحب ! مذہب اور ایمان ان جنسی حرام کاری کی باتوں سے بہت بالا چیز ہے، جسے نہ عورت کے لئے چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ ہی عورت کی خاطر اس کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے مجھ جیسے شخص پر الزام لگایا ہے، جس نے ایسی کسی اسلامی جنت کو قبول کرنا پسند نہیں کیا، جس میں مومن مردوں کے لئے ناپاک جنسی خواہش کی خاطر حوریں یا لونڈیاں ہیں، جب کہ سچے آسمانی خدا کے پاک حضور میں تو انسانی اور جسمانی اور بدنی خواہش ہر گز نہ ہوگی اور خدا کے سامنے لوگ پاک فرشتوں کی مانند، روحانی حالت میں ہونگے، جہاں گناہ کا گزر تک ممکن نہیں۔

شاہ صاحب کا چہرہ تو غصہ سے کبھی پیلا پڑے اور کبھی سرخ۔ اور پھر آپ غضب ناک ہو کر دھاڑے۔ خاموش، بد تمیز چھوکرے ! شاہ صاحب بے قابو ہوگئے۔ شاہ صاحب ! غصہ میں آنے کی ضرورت نہیں، آپ بات کریں۔ میں نے عرض کیا۔" سیڑھیوں سے نیچے پھینک دو، اس گستاخ کو " شاہ صاحب بھڑک اٹھے۔" اپنا خون " خبردار ! شاہ صاحب ! میرے سگے بھائی کو ہاتھ لگانے کی ہر گز ہمت نہ کرنا۔ اگر اس کو مارنا ہی تھا تو کیا ہمارا اپنا ہی خاندان، اس کو نہیں مار سکتے تھے؟ میرے بھائی صاحب، اس شاہ صاحب پر خوب زور سے چنگھاڑے۔ بھائی میں بھی اپنا ہی خون تھا۔ آخر جوش میں آگیا۔ اور ہم تینوں سیڑھیاں اتر آئے۔

ب۔ اختتام قضیہ

خالو اور بھائی صاحب اور باقی تمام عزیزوں کی تمام تر ناکام کوششوں کے بعد جب محسوس کیا گیا کہ مسیح کی محبت میں میرا نشہ نہیں اترا، تو مجھے لاہور پہنچایا گیا۔ کیونکہ ضلع شیخوہ پورہ میں خالہ کے گاؤں سے کچھ فاصلہ پر، میں ایک گاؤں میں رات کو، گھر والوں کے سوجانے کے بعد، ایک مسیحی خادم سے ملنے چلے جاتا تھا۔ اور مسیح کے اس گواہ کے ساتھ مل کر دعا، کرکے اپنے لئے، روح القدس کے وسیلہ، روحانی قوت حاصل کرتا تھا۔ اس خادم کا نام کیپٹن آیزک تھا۔ میری ان ملاقاتوں کا علم میرے خالو کے عزیز ذیلدار حسین علی کو ہوچکا تھا، جس سے یہ نتائج برآمد ہوسکتے تھے کہ وہ مجھ کو اذیت ناک سزا دیں۔ خدا کے اس مسیحی خادم سے میری ملاقات کو روکنے کی غرض ہی سے مجھے شہر لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔

لاہور کو اسلئے منتخب کیا گیا کہ راوی دریا، قریب پڑتا تھا اور راوی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ زندہ انسانوں کو اپنی لہروں کی لپیٹ میں لے کر ان کے زندگی کے زمینی سفر کا اختتام کردے، اور جو مردے، اس کے سپرد کئے جائیں، ان کو بہا کر، کسی اور ہی دنیا میں لے جائے۔ یہ کام انجام دیتے ہوئے دریائے راوی کو مدتیں گذر گئی ہیں اور ۱۹۴۷ء میں تو دریائے راوی نے اس خدمت کو بڑی فراخدلی سے انجام دیا تھا، جب یہ ہندوستان

کے شہر گرداسپور اور پٹھان کوٹ کی طرف سے ، موت کے ڈنگ سے ڈسے مسلمانوں کو یہ اپنے بے رحم سینہ پر اٹھالاتی تھی۔

لاہور کے قیام میں بحث و تمحیص کا سلسلہ بند رہا، تاکہ برادری کے لوگوں میں بات نہ پھیلے ۔ لیکن میں وقت پاکر گوجرہ کے پادری وٹن صاحب کو اپنے حالات سے باخبر کرتا رہتا تھا۔ ایک روز ایک مشنری برادر ڈگلس ، میرا نام پوچھتے ہوئے ، مجھے ملنے آگئے ۔ کسی کو میرے نئے نام کا علم ہی نہیں تھا۔ جب میں نے انہیں بازار میں کھڑے دیکھا تو خود ہی آگے بڑھ کر انہیں بتایا کہ " غلام مسیح" میں ہوں ۔ میری خیریت پوچھ کر وہ چلے گئے۔

لیکن یہ بات میرے گھر والوں اور خصوصاً میرے بھائی صاحب کے دوستوں کو ناگوار گذری ، اور اس شام یہ فیصلہ کیا گیا کہ آج رات اس قضیہ (کہانی) کو جڑ ہی سے ختم کردیا جائے اور کل صبح ، منہ اندھیرے ، اس کی لاش کو ، بوری میں ڈال کر ،دریائے راوی کے سپرد کردیا جائے تاکہ یہ ندامت ختم ہوجائے۔

دسمبر کی ۵ تاریخ، ایک نہایت ہی سرد رات تھی، شام کے کھانے کے بعد میرے سب کپڑے اتروالئے گئے ، سوائے ایک دھوتی اور بنیان کے ، اور خالی کمرہ میں بند کرکے باہر سے کنڈی لگادی گئی ۔ میرے کپڑے اس لئے اتروالئے گئے تاکہ میں سردی کی وجہ سے سن ہوجاؤں اور کوئی مدافعت نہ کرسکوں۔ لیکن پاک اور برحق مسیح ایمان کی حرارت نے مجھے سردی سے بھی محفوظ رکھا۔ جب مجھے اپنی موت بہت ہی قریب سے نظر آنے لگی، تو میں نے اپنے پاک اور سچے آقا یعنی سیدنا مسیح سے اس وقت ایک آخری دعا کی ، جو کسی لحاظ سے مشروط نوعیت کی تھی، مگر یہ دعا میں نے اپنے پورے دل ، جان، عقل ، قوت اور روح میں کی۔

"میرے مالک و نجات دینے والے المسیح!

میری روح پرسکون ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں

کہ میں اس فانی جسم یا بدن کو چھوڑنے کے بعد تیرے پاس آونگا

اب کوئی دیوار میرے اور تیرے درمیان حائل نہیں ہے۔

تیرا شکر ہو! لیکن لوگ اور خاص طور پر اس خونی

کھیل میں شریک لوگ کیا تاثر لیں گے کہ انہوں

نے تیرے شیدائی کو ختم کردیا ہے!

موت تو میرے لئے ابدی زندگی کا دروازہ ہے!

لیکن ان کے لئے تیرا نام، میری موت کے ساتھ ہی، ختم ہوجائے گا۔

اس لئے اگر تو پسند کرے تو مجھے آج یہاں سے رہائی دے کر،

مجھے یہ حق دیدے کہ میں تیری نجات کے بڑے بڑے

کاموں کا ذکر لوگوں کے درمیان کرسکوں۔

گناہوں میں برباد اس دنیا کو میں بتاسکوں کہ

مسیحا تو آج بھی، لوگوں کی روحوں زندہ اور تازہ کرتا ہے۔

اور اس زندگی میں گناہ گار انسان کو ابدی زندگی کا یقین دلاتا ہے۔

میں چاہتا ہوں میرے خداوند مسیح ! میرے حقیقی مالک!

میرے اور تمام انسانوں کے نجات دہندہ!

جس طرح۔۔۔ میری اس زبان سے جہاد کے نام پر تیرے ہی بنائے

ہوئے لوگوں کی قتل وغارت کے احکام صادر ہوتے رہے ہیں،

آج کے بعد اسی زبان سے تیری زندگی بخش باتوں کا

بیان ہو جن کا ذکر تیری پاک اور سچی انجیل میں ہے۔

گناہ اور موت سے بچانے والی تیری الہیٰ قدرت

کو میری ان آنکھوں نے دیکھ لیا ہے۔

اب اگر تو پسند کرے تو مجھے یہاں سے نکال لے

اور کل کی صبح میری زندگی میں نئی صبح ہو!
اس موت کی کوٹھری سے رہائی، میرے لئے اس بات کو سندھو
کہ تو مجھ کو اپنی مسیحی گواہی کے لئے زندہ رکھنا چاہتا ہے!
میں چاہتا ہوں۔ اے خداوند مسیح! کہ آج رات، میں خود اپنے
ہی خونِ جگر سے، وضو کرکے، ایسی نماز، ادا کرنے کی،
نیت باندھ لوں گا کہ اگر تو زندہ رکھے، تو اپنی باقی زندگی کے دن،
تیرے پاک یسوع نام کو، سر بلند کرنے کی خاطر گذاردوں،
اے خداوند یسوع مسیح! تو میری خدمت اور مدد کا محتاج تو نہیں،
لیکن یہ میری خدمت ہو گی کہ جیسے میں تیرے ہی بنائے ہوئے
انسانوں کو جہاد کے نام پر مٹانے میں سر گرم تھا،
ویسا ہی جذبہ، اب دوسروں کو موت سے بچانے
اور تیرے پاس لانے کے لئے مجھے حاصل ہو۔
اے پاک یسوع مسیح! اگر تیری یہ مرضی ہے تو مجھے
آج اور اسی وقت یہاں سے رہائی دے دے۔ آمین!

بجائے اس کے کہ میرا بدن سردی سے سن ہوجاتا، اپنے آقا و مولا سیدنا مسیح سے، میں نے دعا سے فارغ ہو کر دیکھا کہ میری پیشانی پر پسینہ کے قطرے تھے۔

اسی ثنا میں اچانک یوں ہوا کہ " کسی " نے باہر سے کنڈی کھولی۔ میں تھوڑی دیر تک صبر کرکے دروازہ پر آیا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سنوں، مگر کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا، اور دیکھا کہ پوری گلی سنسان تھی اور میرے کان میں سیدنا مسیح نے آواز دی" بھاگ نکلو! میں نے دروازے کھولا ہے!"

میں اسی حال میں بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن کہاں جاؤں؟ لاہور میں تو کوئی بھی مسیحی دوست نہیں ہے، جو واقف کار ہو، سو ان دوستوں کے جو مسلمان ہیں۔ میں لاہور سے رائے ونڈ کی طرف آنے والی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ لاہور چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پار کرنے کے بعد ایک ویرانہ میں ریلوئے لائن سے گر کر ایک نشیب میں جا گرا۔ کیونکہ سردی نے بدن کو جکڑلیا تھا۔

دن کے قریب گیارہ بجے، سورج کی تپش نے گرم کرکے دوبارہ آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔ میں ہوش میں آچکا تھا۔ ماڈل ٹاؤن لاہور کی طرف رخ کیا لیکن اپنے ننگے پن اور بڑے بڑے بنگلوں کا موازنہ کرکے ایک طرف مڑگیا۔ ماڈل ٹاؤن کے پیچھے ایک گاؤں نظر آیا۔ اس گاؤں میں داخل ہوا تو میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے ایک بچے سے پوچھا:

" برخوردار یہاں کوئی مسیحی ہے؟ جی ہاں! میرے والد صاحب پادری ہیں! مگر آپ کو ان سے کیا کام ہے؟ بس مجھے اپنے والد صاحب کے پاس لے چلو" میں نے اس بچہ سے التجا کی۔

یہ ننھا بچہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ یہ کیپٹن سیموئیل تھے، جو بڑے تپاک کے ساتھ مجھے ملے اور مجھے تسلی دی کہ اب تم محفوظ ہو۔ اگر کوئی آفت آئی تو پہلے وہ خود کر قربان کردیں گے۔ میری مختصر کہانی سننے کے بعد وہ آبدید ہوگئے اور میرے ساتھ مل کر نجات دہندہ، سیدنا مسیح سے دعا کی اور بستر میں لٹادیا۔ اس کے بعد ایک دیہاتی ڈاکٹر کو بلوالائے۔ جس نے مجھے دوا دی اور سوئی بھی لگائی۔

میں قریب چار روز تک ان کے پاس رہا، اور پھر میں نے کیپٹن صاحب سے کہا کہ میں گوجرہ جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک قمیض اور ایک جوتا اور ایک کھیس دیا اور پانچ روپے بھی ہاتھ میں تھمادیئے۔

میں دسمبر کی غالباً ۱۵ تاریخ کو گوجرہ آگیا۔ مجھے دوبارہ زندہ سلامت پا کر سب دوست واحباب بہت خوش ہوئے، خصوصاً وٹن صاحب پادری بی ایم آگسٹین ، سیوک بوٹا مسیح اور ماسٹر چرن داس صاحب۔ اور میں نے بڑے دن کی عبادت اپنے ایک دوست باوا مسیح کے گاؤں میں، آس پاس کے دیہات کے لوگوں کے ساتھ کی اور بہت لطف آیا۔ باوا مسیح، آیئور ہوسٹل گوجرہ میں خدمت کرتے تھے اور میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ان کے والد صاحب اور چھوٹی بہن گریس بھی سیدنا مسیح کی محبت بہت پیار کرتے تھے۔ سب سے بڑی بات تھی یہ کہ میں نے اب مسیحی برادری کا ایک فرد بن کر، ان غریبوں اور نادر لوگوں کو، اپنے عزیزوں میں شامل کرلیا یا پھر انہوں نے مجھے قبول کرلیا۔ یہ بات تو دونوں طرف سے ہی بنتی ہے۔ آج وہ نو مسیحی ، جو اپنے نامقبول ہونیکی شکایت کرتے ہیں، انکی اپنی زندگیاں بھی مشکوک ہوسکتی ہیں یا خود مخلص اور قابل اعتماد نہیں ہوتے ۔ مگر اگر وہ آسمان کی بادشاہی کی خوشخبری اور خدا کی راست بازی کی منادی دینے میں، مسیح کی طرح پاک دلی سے مخلص ہوں، تو خدا باپ مسیح نام میں خود بھی ان کو قبول کرے گا اور مسیح کے لوگ بھی ایسے صاف دل نومرید مسیحی گواہوں کو اپنی کلیسیاؤں میں جگہ دیں گے ۔ مگر ضروری ہے کہ وہ ہر بات میں ، ہر حالت میں اپنے آقا مولا سیدنا مسیح پر بھروسہ کریں ، نا کہ کسی انسان پر یا کسی پادری پر یا کسی چرچ پر۔ اگر کوئی مسیحی قبول نہ بھی کرے ، تو بھی فکر نہیں، کہ خدا باپ نے مسیح میں تو قبول کرلیا ہے، اور جب آسمان نے قبول کرلیا ہے ، تو زمین کے حالات کو فکر نہ ہو، کہ خدا خود ہی اپنی خدمت کے حالات اور مواقع پیدا بھی پیدا کرے گا۔ ہمیں صرف ، مسیح کے پاک کلام اور اسی کی پاک روح سے معمور ہونا ہے، اور ہر وقت اور ہر حالت میں مسیح کے مردوں میں سے زندہ ہونے اور آسمان کی بادشاہت کے کلام کی منادی اور گواہی دینا ہے۔ باقی تمام اور خدمت لینا، ہمارے سیدنا مسیح کا ہے۔ ہمیں اپنی فکر فقط اسی پر ایمان سے ڈالنا ہے کہ اس کو ہماری فکر ہے۔

نمازِ عشق

غالب، نمازِ عشق نہ ہوگی کبھی قبول
اپنے ہی خونِ جگر سے جب تک وضو نہ ہو

الف۔ سجدہ ریز

گوجرہ آنے کے بعد میرے لئے، میرے خیر خواہوں کے پاس، میرے مستقبل کے بارے میں بہت سے مشورے تھے۔ کوئی کہتا کہ کاروبار شروع کرلوں، بعض احباب کہتے کہ مشن کی ملازمت اختیار کرلوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میں کیا کروں گا۔

اپنی مشروط رہنمائی کے بعد، میں نے سیدنا مسیح سے سجدہ ریز ہو کر پوچھا کہ " خداوند ! اب مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیرے بڑے بڑے کاموں کا بیان کرنے کے لئے، دنیا میں کود پڑوں ۔ مجھے ایسی سرمستی عطا کر کہ اس دنیا کے ہنگاموں میں رہ کر بھی، میں اپنے دامن کو پاک اور صاف رکھ سکوں۔ دنیا اور اس کی لذتیں مجھے تجھ سے جدا نہ کردیں۔ میں تیری محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں ایسا ڈوج جاؤں کہ یہ جہان والے مجھے نہ پاسکیں۔ میری مادی زندگی کی ناہموار راہوں میں میری روشنی بن کر میری راہوں کو اجالا کردے، تا کہ میں ٹھوکر کھا کر تیرے پاک اور باعزت نام کے لئے ایک بدنما دھبہ نہ بنوں۔

میں نے بورڈنگ کے نوجوانوں کے ساتھ مل کر گوجرہ کے آس پاس کے دیہات میں جا کر منادی شروع کردی۔ مسٹر وٹن بھی کئی بار ساتھ ہوتے لیکن انہیں ساتھ لے جانے میں احتراز کرتا تھا تا کہ لوگ جو بھی سلوک میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ اس کے بعد خدمت کا دائرہ وسیع ہوگیا اور پورے پنجاب کے دیہات میں جا کر سیدنا مسیح کی گواہی دینے لگا۔ قیام میں، اکثر خدا کے مسیحی خادموں کے پاس ہی کیا کرتا تھا، اور مسیحیوں کے سامنے بھی سیدنا مسیح کی گواہی دیتا تھا تا کہ انہیں بھی مضبوط کروں۔

ایک بار پھر خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے پرانے مسلم دوستوں سے مل کر اپنے گاؤں میں گواہی دوں۔ اسی غرض سے مارچ ۱۹۵۰ء میں ظفر وال گیا۔ معلوم ہوا کہ میری جدائی کے غم کو والدہ نے اتنا گھر الیا کہ چند روز ہی چل بسیں۔ ماں تو بہت قیمتی چیز ہوتی ہے لیکن یہ بھی ہم نے قبول کرلیا، تاکہ اپنے آقا سیدنا مسیح کے لئے سچی نماز کی نیت، ہر گز نہ ٹوٹنے پائے۔

اس کے بعد میرے بھائیوں نے میری طرف سے خوفزدہ ہو کر کئی حربے استعمال کئے۔ انہیں ڈر تھا کہ یہ کہیں اپنے حقوق کے لئے قانونی چارہ جوئی نہ کرے۔ مجھے اس بات کا علم نارووال میں ہوا، چونگی نا کہ پر چند کشمیری نوجوان میری گھات میں بیٹھے ہیں۔ پادری عیسیٰ داس کے گھر پر ایک مسلم دوست نے آکر بتایا کہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ وہ باتیں جو میری نمازِ عشق میں رکاوٹ ہوسکتی ہیں، میں ان سے کنارہ کشی اختیار کرلوں، میں نے تحریر میں دے دیا کہ میں اپنی رضامندی سے اپنے والد چودھری لعل خاں باجوہ کی جائیداد میں، جو میرا حصہ ہے، اس سے اپنے بھائیوں کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔

اسی ماہ ایک شفیق بزرگ پادری چندورے (بعد میں بشپ) سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ میں سندھ، (سکھر) چلا جاؤں، کیونکہ پورے پنجاب میں میری جان کی حفاظت غیر یقینی تھی۔ میں نے مشورہ قبول کرلیا۔

چل بلھیا ہن اوتھے چلئے جتھے رہندے نے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے تے نہ کوئی سانوں منے

سکھر میں ایک مہربان اور بزرگ پادری کارسن صاحب مشنری تھے اور پادری ہرنام داس نند، اور پادری جے بی راوت، بھی انہی اوقات میں تھے۔ میں نے چند ماہ بائبل سوسائٹی کے زیر انتظام کام کیا، لیکن ضمیر نے آواز دی کہ یہ تو پھر وہی کاروباری سلسلے کا آغاز ہو گیا۔

میں نے بڑی عاجزی اور انکساری کے انداز میں اس ملازمت کو الگ رکھ دیا، اور پادری کارسن صاحب سے سندھی زبان سیکھنا شروع کردی۔ بہت تھوڑی محنت کے بعد سندھی زبان، بڑی روانی سے بول، پڑھ اور لکھ سکتا تھا، جس سے زبان کا خلاء دور ہو گیا۔

اس زمانے میں سکھر کی گرمی میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی، چونکہ میں آزمائش کے طور پر، گوجرہ کی گرمی کو بھی سہہ گیا تھا، لیکن دورانِ نماز مشکل تھا۔ اس لئے میں گرمی گزارنے پنجاب چلاآیا، لیکن میں نے سندھ کو، مسیحی خدمت کے لئے، قبول کرلیا۔

پنجاب میں میری ملاقات لائلپور کے ایک درویش سیرت امریکن دوست پادری نیروئی سیلی سے ہوئی۔ جنہوں نے مجھے اپنے ساتھ نوجوانوں میں خدمت کرنے کی دعوت دی۔ لائل پور کنونشن، دراصل اسی زمانہ میں پہلی بار شروع ہوئی تھی اور ابتدائی دو برسوں میں یہ "یوتھ کنونشن" تھی۔

چونکہ میرا کوئی گھر نہیں تھا، اور مشنریوں کے گھروں میں رہنا، میں پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے خداوند کی طرف سے یہ انتظام ہوا کہ لائل پور کے ایک بزرگ، چودھری جلال مسیح نے مجھے، اپنے گھر میں پناہ دی اور میں نے ان کو اپنے باپ کا مقام دے دیا۔ ان کے اکلوتے بیٹے یعقوب کو بطور اپنے بھائی کے قبول کیا اور ان کی بیٹی خورشید کو اپنی چھوٹی بہن بنالیا۔ اور جو اس خاندان کے عزیز واقارب تھے، ان کے گھروں کے دروازے بھی میرے لئے کھل گئے اور میں اپنی نماز (مسیحی بشارتی خدمت) میں اور بھی زیادہ یکسائی سے مصروف ہو گیا۔

ج۔ شریک نماز

کیماڑی کراچی سے لنڈی کوتل تک سائیکل کی سیٹ پر تقریباً بارہ ہزار میل کا کئی بار سفر کرکے، جنوبی سندھ کے قبائل میں گجراتی زبان کو سیکھنے کے بعد، معہ تین ساتھیوں کے ایک خاص میواسی اور بھیل قبیلہ میں، میں نے بشارتی خدمت کا آغاز کیا۔ دو برس متواتر ایک پیپل کے درخت اور پھر ایک جھونپڑی میں رہ کر، ان ہندو قبائل میں خدمت کرتا رہا، تو کلیسیاء کے بزرگوں نے محسوس کیا کہ مجھے زیادہ مفید خادم بنانے کے لئے الہیات کی تعلیم کی تحصیل کے لئے بھیجا جائے۔

میرے تین رفیقوں میں سے ایک تو پٹڑی سے اتر گئے ۔ انہوں نے ایک صنفِ نازک سے متصادم ہو کر شادی کرنے کے لئے ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن منظور اور عطا اللہ میدان میں ڈٹے رہے، اور ممکن ہے کہ اب تک بھی ہوں۔

میرے علمِ الہیٰ کی مزید تعلیم کے لئے جانے سے قبل، ایک محترمہ نے آکر میرے کان میں کہا، " بھلے آدمی ! جذبات سے جنگ تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ تمہارا زھد ٹوٹ جائے گا، تمہارے ہاتھ کی تسبیح کا ڈور ٹوٹنے کو ہے، اس خوبصورت تسبیح کے دانے بکھر جائیں گے اور لوگ تمہارا مضحکہ اڑائیں گے، تم کب تک ان درختوں کے بے قیام سایوں کے تلے پناہ لوگے ، یہ تمہاری نماز اس دنیا کے تھپیڑوں میں قائم نہ رہ سکے گی، کسی کو شریکِ نماز کرلو۔"

لائل پور کی مسیحی بستی میں رہ کر بھی ہم نے اپنی نیت میں خلل نہیں آنے دیا تھا۔ چونکہ اس خاتون نے ہماری بے خانماں زندگی پر رحم کرتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ مشورہ دیا تھا ، اس لئے ہم نے رضامندی ظاہر کردی، اورلائل پور والے ، ابا حضور چودھری جلال مسیح اور ان کے سمدھی اور عزیز منظور کے والد نے مل کر راہوں کو ہموار کردیا، اور وہی محترمہ ڈیزی ۱۹۵۸ء میں میری شریکِ حیات ہو گئیں۔

یہ میری بے سروسامانی کا دور تھا۔ درسگاہ میں بہت ہی تھوڑا وظیفہ ملتا تھا۔ لیکن ایک کیف وسرور تھا اس نماز میں، کیونکہ اکتوبر میں شروع ہونے والی سہ ماہی سے ہم نے اپنے نام " غلام مسیح" کے ساتھ " نعمان" کا اضافہ کردیا تھا۔ اس غرض سے کہ مجھے اپنا تاریک ماضی نہ بھولے اور میں حال کی دوڑ میں ثابت قدم رہ کر مستقبل میں " قبولِ نماز" کا شرف حاصل کرکے سرخرہوسکوں۔

تربیت کا یہ عرصہ بچپن کی حسین چاندنی راتوں کی طرح بہت جلد گزر گیا، اور میں اور ڈیزی فارغ التحصیل ہو کر اپنے پرانے دیش سندھ میں آگئے۔

دو برس سے کچھ عرصہ کم ، حیدر آباد (پاکستان) میں بزرگ پادری جون راوت صاحب کی زیرِ نگرانی ، دیہات میں بشارتی اور پاسبانی خدمت کرنے کے بعد فروری ۱۹۶۰ء میں ہم میر پور خاص (سندھ) آگئے، جہاں پر اس سے قبل بھی خدمت کرچکا تھا۔ دیہات کی خدمت میں ڈیزی میرے شانہ بشانہ تھیں۔ لیکن ہم دونوں ہی تھے، اور میری عدم موجودگی میں ڈیزی گھر پر اکیلی ہوتی تھی۔ اس خلاء کو خداوند پاک خدا نے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو پُر کردیا۔ کیونکہ خداوند نے ہمیں ایک بیٹا دے دیا جس کو ہم نے ، دسمبر ۱۹۵۹ء میں خداوند سے مانگا تھا۔ اور ہم نے اس کا نام سیموئیل نعمان رکھا۔

بیٹی کے بغیر گھر طبیلہ ہوتا ہے۔ اس لئے خداوند نے خانہء نعمان کو پُر رونق بنانے کے لئے ۱۷ اپریل ۱۹۶۲ء کو ہمیں ایک بیٹی خلدہ دے دی۔

۱۹۶۳ء میں میری ضرورت کوئٹہ میں محسوس کی گئی اور ہم یہاں چلے آئے ۔ یہاں آکر بندہ نے علامہ رشید سے پشتو زبان سیکھی اور پشتو بولنے والے غیر مسیحی بھائیوں میں، اپنے مسیح کی گواہی دیتا رہا، اور ساتھ ساتھ پادری عنایت رومال شاہ صاحب سے آدابِ فرزندی بھی سیکھتا رہا، کیونکہ آپ وکرِ انچارج تھے اور میں مسیحی ہسپتال کا چیپلن تھا۔

۱۹۶۳ء ستمبر میں خدا نے سیموئیل کو اکیلا دیکھ کر اور ایک اور بھائی دے دیا، جس سے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی، اور نعمان سیموئیل کا چھوٹا بھائی عوبید نیر آ گیا۔

کام کے دباؤ کی وجہ سے مئی ۱۹۶۵ء میں مجھے دل کا عارضہ ہو گیا اور ڈاکٹروں کے مشورہ کے تحت ہم دوبارہ میر پور خاص آ گئے۔ باوجود ڈاکٹروں کے منع کرنے کے، کوھلی اور بھیل دوستوں میں دوبارہ کام شروع کیا، اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے سیدنا مسیح کو اپنا شخصی نجات دہندہ اور آقا قبول کیا۔

بدن کے ساتھ ساتھ بیماریاں اور عارضہ بھی ہوتے ہیں۔ میر پورُ خاص کے علاقہ میں خدمات کی خوشی اور پھل کے ساتھ ایک تکلیف اور بھی مل گئی " دردِ گردہ" جس سے نجات پانے کے لئے ایک گردہ قربان کرنا پڑا۔ چونکہ گردہ کے درد میں اس علاقے کے پانی کو، زیادہ دخل تھا۔ اس لئے موجودہ بشپ روڈڈین صاحب کے ایماء پر جولائی ۱۹۷۳ء میں سکھر آ گئے، جہاں سے سندھ کی خدمت کا آغاز ہوا تھا۔

لوگوں اور مشنری صاحبان کے خیال میں یہ مشکل کلیسیاء تھی۔ لیکن میرا تجربہ اس سے مختلف رہا۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت بہت اچھے اور مددگار قسم کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ صرف چند ایسے افراد تھے، جو احساس کمتری کا شکار تھے۔ اگر ان کے مرض کو سمجھ کر بروقت کوئی موثر دوا دی جاسکتی تو یہی لوگ بہت کام کے تھے، اور مجھے کبھی ان لوگوں سے شکایت نہ ہوئی تھی۔

میں ہمیشہ اپنے آپ کو پرکھتا اور جانچتا رہتا، کہ کیا میں ان لوگوں کو مسیحی روحانی خوراک مہیا کر رہا تھا، جس سے ان لوگوں کی روحانی نشوونما ہوسکتی تھی؟ اگر نہیں تو پھر، لوگوں کو الزام دینے کا، مجھے کیا حق حاصل ہوسکتا تھا؟

د۔ قبولِ نماز

مزید تفصیل کا وقت تو نہیں، مگر صرف یہ بیان کردینا کافی ہوگا، کہ خدا باپ آسمانی کے پاک حضور میں، سیدنا مسیح کے وسیلہ، میری نماز قبول ہوچکی تھی۔ گزشتہ برس جب میں ڈایوسیس کے اجلاس میں کراچی گیا تو داؤد منظور کو، ہولی ٹرینیٹی کیتھڈرل (چرچ) میں عشاء ربانی کی رسم ادا کرتے دیکھ کر، میری گردن شکر گزاری کے احساسات کے تحت، سجدہ میں جھک گئی، اور جب میں نے، ان کے ہی ہاتھ سے پاک عشاء لی تو ایسی خوشی کی لہر، میرے بدن میں، برقی رو کی طرح دوڑ گئی، کہ میرا دل، بیلوں اچھلنے لگا۔ کیونکہ منظور داؤد بندہ ہی پنجاب سے سندھ لایا تھا، اور اسے میں نے پہلی بار ۱۹۵۲ء میں دیکھا تھا اور ۱۹۶۶ء میں وہ میری ہی ہاتھوں مسیحی ہوا اور پھر مبشر اور بعد میں پادری بن کر کہانت کی خدمت پر مامور ہوا۔

میرے جیسے نااہل انسان کے لئے اور کیا اجر ہوسکتا تھا؟ کیا آپ کو مجھ سے اتفاق نہیں ہوگا کہ اس سے، مجھے میری ریاضت کا، صلہ مل گیا، اور آسمانی خدا باپ کے سامنے سیدنا مسیح میں میری نماز قبول ہو گئی۔

تیرے در کی عبادت میں، فنا ہوتی ہے، جو ہستی
وہ اوروں کے لئے، خود اک عبادت ہوجاتی ہے

گریبان کو مزید چاک کیا جانا ابھی اور بھی ممکن ہے، مگر اب وقت نہیں۔ ہم نے اس کتابچہ میں انہی باتوں کا ذکر کرنیکی کوشش کی ہے۔ جو ایمان افروز ہیں، ورنہ اس دنیا میں اور خصوصاً اس کلیسیاء میں رہ کر، ایک میرے جیسا فراخدل شخص، کیونکر الزامات سے بری رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ سب دکھ کی باتیں، اس لئے لکھی گئیں، جس نے اتنی بڑی دلیری عطا کی تھی۔ جس کے ایماء پر ہم نے اپنے پاک مسیحا کے لئے وہ کر دکھایا، جو عام انسانوں کے

لئے مشکل نظر آتا ہے۔ اور جو کچھ ملا ہے، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ ہماری زندگی کا ایک ہی رخ ہے۔ یعنی (رخِ مسیحا) جو سب پر عیاں ہے، جس سے کوئی بات بھی چھپی نہیں ہے۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ ابلیسی قوتوں نے، سیدنا مسیح کے قدموں سے دور کرنے کی ہزار کوششیں کیں، کہ ہم بدِ دل ہو کر، جہالت، ظلمت، جھوٹ، گناہ اور موت کی طرف پیچھے لوٹ جائیں، اور اپنے سچے اور پاک مسیحا کا انکار کریں، لیکن سیدنا مسیح کا شکر ہو کہ ابلیس اور اسکے پیروکار، سب برابر ناکام رہے ہیں۔

عدو نے سینکڑوں جھٹکے دیئے ہیں
ہمارے دامن کتنے کڑے ہیں!

احقر اور محتاج دعا
غلام مسیح نعمان
۱۹ جون ۱۹۹۸ء۔